اللہ تعالیٰ کے فضل اور رحم کے ساتھ

ماہنامہ

قندیلِ ادب

فروری 2016ء

مدیر: رانا عبدالرزاق خان

07886304637 & 02089449385

rana_razzaq@hotmail.com

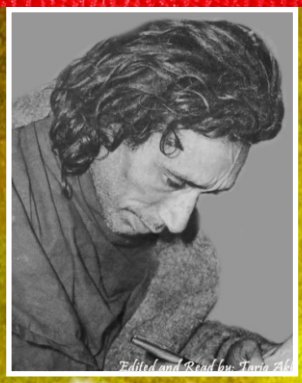

ساغر صدیقی

تیرے غم کی تلاوت کر رہے ہیں
ستاروں سے شکایت کر رہے ہیں
جنوں کے تجربوں کی نگہداری
بہ اندازِ فراست کر رہے ہیں
ترے شانوں پہ تابندہ نشاطے
بہاروں کی سخاوت کر رہے ہیں
سحر کے بعد بھی شمعیں جلاؤ
کہ پروانے شرارت کر رہے ہیں
خداوندانِ گلشن پہ شگوفے
بہاروں سے بغاوت کر رہے ہیں
مرتب غم کے افسانوں سے ساغرؔ
مسرت کی حکایت کر رہے ہیں

شمارہ نمبر:38 فروری 2016ء

فہرست

نامے جو میرے نام آتے ہیں	ادارہ	1
غزلیات: محمد علی مضطر، آدم چغتائی، مبارک صدیقی، عامر امیر، منظر ایوبی، عبدالکریم قدسی، ساجد محمود رانا، انجم شہزاد، پروفیسر شاہد اقبال لندن، فوزیہ مغل جرمنی، ڈاکٹر منور احمد کنڈے، محمد فاروق نسیم برمنگھم، فرزانہ نیناں نوٹنگھم، ہما خان برمنگھم، عبدالمجید ظفر،		3-4
نیشنل ایکشن پلان اور سیاسی...	اے آر راجپوت لندن	7
ڈاکٹر سلطان محمود شاہد مرحوم	ڈاکٹر پرویز پروازی	8
حالات وطن	رانا عبدالرزاق خان لندن	11
ارفع کریم	شیراز وحید خان۔	12
آخری پڑاؤ	جتندر بلّو	12
جستہ جستہ	عاصی صحرائی	16
قائداعظم اور آج کے قائدین	رجل خوشاب	18
مقبول شاعر کیفی اعظمی	رانا عبدالوحید خان	19
رام ریاض۔ احمد فراز	فراز حمید خان۔ بلال افتخار	19
ناموراستاد شاعر خواجہ حیدر علی آتش	منور خورشید	20
حفیظ جالندھری	اعزاز لطیف خان	21
دانشور پروفیسر احمد علی	سید حسن خان	21
ابن انشاء	ساجد محمود رانا	21
شفیق الرحمن	محمد ابراہیم عابد	22
اعتزاز حسن	تقلین مبارک	22
حفیظ ہوشیار پوری	سردار فضل عمر ڈوگر	22
حکیم محمد سعید	بشارت احمد خان	23
شذرات	شیخ نسیم صاحب	23
اسباب زوال	رفیق ڈوگر صاحب	23
محبت کے بیج	اشتیاق حسین	24
پاک وطن کے 3 دشمن پہچانو	عاصی صحرائی لندن	25
شگفتہ عزل ہاشمی کے نام شام	حسیب اعجاز عاشر	26
آفاتِ سماوی	سید حسن خان	28
ملکہ وکٹوریہ	عامر سہیل مانچسٹر	28
دنیائے ادب میں ایک قابل قدر	اختر ضیائی چیئرمین ایشین لٹریری سرکل	29
مشاعرہ قندیل شعروسخن برطانیہ	عاصم صحرائی	30
اوچ شریف	ابن خوشاب	30
ایک خطبہ جمعہ	نذیر ناجی	31
مسلمان ہندو اور مولوی	رانا محمد حسن	32
برگزیدہ شجر	رانا عبدالرزاق خان لدن	33
مشاعرہ قندیل شعروسخن (تصاویر)	رانا عبدالرزاق خان	34

مجلس ادارت

زکریا ورک، امجد مرزا امجد، ایم اے حق بھارت، خواجہ عبدالمومن ناروے، آصف علی پرویز

نگرانِ اعلیٰ	:	خان بشیر احمد خان رفیق لندن
مدیر	:	رانا عبدالرزاق خاں
معاون مدیر	:	سید حسن خان
مدیر خصوصی	:	سہیل لون
ڈیزائنر	:	خورشید خادم
مینجنگ ڈائریکٹر	:	عاصی صحرائی
فوٹوگرافی	:	قاضی عبدالرشید، فضل عمر ڈوگر
آڈیو وڈیو	:	محمد اشرف خاکی

اراکین مشاورتی بورڈ

آدم چغتائی، منور احمد کنڈے، رضیہ اسمٰعیل برمنگھم، رند ملک کنیڈا، اسلم ناصر آسٹریلیا، اے حق یو کے ٹائمز، ثقلین مبارک آسٹریلیا، رانا مبارک احمد بحرین، بشیر احمد خان سویڈن، راجہ منیر احمد، ڈاکٹر منصور خوشتر بھارت، منور احمد خورشید۔

گزارش

ہم سب اہل علم احباب کی خدمت میں گذارش کرتے ہیں کہ اپنے ادبی فن پارے، غزل، نظم، افسانہ، مشاعرے کی روئیداد وغیرہ جو بھی اِن پیج میں ارسال کیا جائے گا۔ بلاتفریق اسے معیار کے مطابق شائع کیا جائے گا۔ جو دوست بھیجتے ہیں اُن کی قدر کی جاتی ہے۔ قندیل ادب تمام ممالک جہاں اسے قائین موجود ہیں تقریباً دو لاکھ قارئین تک جاتا ہے اور ویب سائٹ سے بھی پڑھا جاتا ہے۔ ہماری کوشش ہے کہ ہم نادر اور نئی تخلیقات کو اس میگزین میں جگہ دیں۔ اور ہر بھیجنے والوں کی حوصلہ افزائی کریں، اور اس میگزین کا معیار بھی عوامی کریں۔ ہر ادیب و شاعر، نقاد، افسانہ نگار، اُردو کے خدمتگار کی عزت افزائی کریں۔ ہمیں کوئی صلہ مقصود نہیں۔ اگر آپ نے کوئی کتاب لکھی ہے تو اس کا نام اور تعارف لکھ بھیجیں۔ اگر آپ کے پاس ادبی فن پارہ کوئی نہیں تو اپنے ریمارکس ہی ارسال کر دیا کریں تاکہ ہم اپنا محاسبہ کرتے رہا کریں۔ شکریہ۔ رانا عبدالرزاق خاں

نامے جو میرے نام آتے ہیں

محترم مدیر قندیل ادب انٹرنیشنل لندن آداب

آپ کا میگزین مسلسل ملتا ہے اگر نہ بھی ملے تو ویب سائٹ سے آسانی سے نکال لیتا ہوں۔ یہ ایک متفرق رنگوں کا گلدستہ ہے۔ ایک ڈائجسٹ ہے۔ غزلیں، لطائف، افسانے، سیاسی تبصرے مع حوالہ، وعظ و نصائح، حقائق اور سب ہی طبقات کا نقطہ نظر، مادر وطن سے محبت، مسلم اُمہ کا درد، سیاسی مقتدر ممالک کے بھیانک ارادے، مغربی ممالک کا تعصب، مسلمان ممالک کی بے وقوفیاں، اور بے انصافیاں، اس کوزے میں سمندر بند ہوتا ہے۔ اور اس میں بہت ہی معلوماتی مواد مل جاتا ہے۔ چار سال سے اسے مستقل مزاجی سے چلانے، اور سب احباب تک بے لوث جذبے سے پہنچانے پر آپ کو اور آپ کی ٹیم کو مبارک باد۔ اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ۔ (ثقلین مبارک سڈنی آسٹریلیا)

غــزل

غزل ۔ محمد علی مظفر

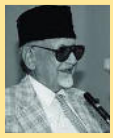

تیرے کوچے میں بکھر جاؤں اگر!
حادثہ اک یہ بھی کر جاؤں اگر!
اپنی غزلوں کو سجا کر طشت میں
تیرے دروازے پہ دَھر جاؤں اگر!
عہد کی تصویر کو کرکے خفا
اس میں کوئی رنگ بھر جاؤں اگر!
میں ترا ہی عکس ہوں لیکن ترے
پاس سے ہو کر گزر جاؤں اگر!
واپس آجاؤں میں اپنے آپ میں
اپنی آہٹ سے نہ ڈر جاؤں اگر!
کیوں بلا بھیجا تھا اتنے پیار سے
اب کبھی واپس نہ گھر جاؤں اگر!
تجھ سے ملنا تو انوکھی بات ہے
خود سے مل کر بھی مُکر جاؤں اگر!
حادثہ ہو جائے شہرِ ذات میں
اس ٹریفک میں ٹھہر جاؤں اگر!
کوئی سمجھے گا نہ اب میری زباں
لوٹ کر بارے دِگر جاؤں اگر!
عقل کے میدان میں کھا کر شکست
عشق کی بازی بھی ہر جاؤں اگر!
جی اُٹھوں مظفؔر! ہمیشہ کے لئے
مسکرا کر آج مر جاؤں اگر!

کڑوا سچ: مولانا طاہر اشرفی کہتا ہے کہ مولانا شیرانی غنڈہ، بدمعاش اور جھوٹا ہے۔مولانا شیرانی کہتا ہے کہ طاہراشرفی، شرابی، تخریب کار اور فساد کی جڑ ہے۔ جبکہ میرے خیال میں دونوں علمائے حق ایک دوسرے کے بارے میں سچ کہہ رہے ہیں۔

دُعا ۔ آدم چغتائی

اہلِ انصاف کو پھر تختِ سلیمانی دے
قلبِ مومن کو وہی وسعتِ ایمانی دے
آدمیت کو فراعینِ زمانہ سے بچا
جو ہیں مظلوم انہیں وقت کی سلطانی دے
ایک طوفان کی غماز ہیں ساقط لہریں
بحرِ خاموش کو پھر دولت طغیانی دے
بس سلامت رہے بازار میں حُسنِ یوسف
ہر خریدار کو توفیق کی ارزانی دے
حُسن ہر حال میں تسخیرِ جہاں مانگے ہے
حُسنِ تبلیغ کو خامسؔ سی قدر دانی دے
ایک درویش ترے در پہ چلا آیا ہے
اُس کے کشکول میں لفظوں کی فراوانی دے
میں خطا کار گنہگار ہوں مرے مولا
مری نظروں کو کوئی اور نہ حیرانی دے
جس سے وہ فتنۂ شیطاں کو دبا کر رکھے
اپنے آدم کو وہی قوتِ ایمانی دے

غزل ۔ مبارک صدیقی

دشمنوں سے بھی دوستانہ رکھ
تاک اپنا مگر نشانہ رکھ
سارے کانٹے گلاب بن جائیں
خواب آنکھوں میں شاعرانہ رکھ
ہجر کی بے پناہ غربت میں
وصل کی آس کا خزانہ رکھ
ہے گرانی اگر فصیلِ شب
سحر سے عشق باغیانہ رکھ
جنگ کا ایک یہ بھی حربہ ہے
اپنا انداز فاتحانہ رکھ
پھر مجھے چھوڑ جا تڑپنے کو
پھر کوئی سوچ کے بہانہ رکھ
قیمتِ عشق پوچھنے والے
جان میری ابھی بیعانہ رکھ

غزل ۔ عامر امیر

حُسن تیرا غرور اپنا تھا
سچ تو یہ ہے قصور اپنا تھا
آنکھ اور دل کی ہر زباں پہ پڑا
بولنے میں عبور اپنا تھا
رات یوں تیرے خواب سے گزرا
کہ بدن چور چور اپنا تھا
آئینے میں جمال تیرا تھا
کیونکہ تجھ میں ظہور اپنا تھا
میری ہی بے اعتنائی تھی
ورنہ وہ تو ضرور اپنا تھا
ایک ہی وقت میں جنون و خرد
لاشعور و شعور اپنا تھا
اس کا دل میرے آس پاس رہا
اور دل تجھ سے دور اپنا تھا
اس کے شعروں میں نام میرا نہ تھا
ذکر بین السطور اپنا تھا

آج کا لطیفہ

ایک شیخ نے عربی کو خون دے کر اس کی جان بچائی۔ عربی نے اُسے بی ایم ڈبلیو bmw کار گفٹ کی۔کچھ عرصہ بعد عربی کو پھر خون کی ضرورت محسوس ہوئی تو اسی شیخ نے پھر اُسے خون دیا، اس بار عربی نے اسے ڈانگ ڈانگ ببل کا پیکیٹ گفٹ کیا، شیخ غصے میں مرسڈیز کیوں نہیں دی۔اب ہماری رگوں میں بھی شیخوں کا خون دوڑ رہا ہے نا اس لئے۔

غزل۔منظر ایوبی

کس کس کو رزقِ خاک بنانا پڑا مجھے
نسلوں کا قرض تھا جو چکانا پڑا مجھے
بجھنے لگا چراغِ تمنا تو دوستو!
احسان آندھیوں کا اُٹھانا پڑا مجھے
پھر یوں ہوا کہ ہاتھ سے بندوق گر پڑی
اور دشمنوں کو سر پہ بٹھانا پڑا مجھے
جب بندگانِ حق پہ زمین تنگ ہو گئی
پانی پہ بستیوں کو بسانا پڑا مجھے
نکلا نہ جب سپاہِ جنوں سے کوئی بشر
تنہا ستونِ دار پر جانا پڑا مجھے
منظرؔ یہ حادثہ بھی مقدر میں تھا لکھا
کہ خود قاتلوں سے ہاتھ ملانا پڑا مجھے

آنکھیں خشک نہیں ہوتی ہیں

عبدالکریم قدسی

آنکھیں سرخ تعصب کی ہیں اورمزاج بھی برہم ہے
قدم قدم پرگجرانوالہ قدم قدم پرجہلم ہے
ظلم وستم کی آگ کی حدت دل میں سب محسوس کریں
لیکن اس پرکھل کے بولنے والاطبقہ کم کم ہے
تم دیکھوگے اندھیروں کاسینہ چیرکے رکھ دیگا
معمولی سادیایہ جس کی لوبھی مدہم مدہم ہے
خوب کمائی کرتے ہیں یہ بلو ائیوں کے ڈیریدار
نفرت کے بینر ہاتھوں میں بدامنی کاپرچم ہے
رنگ ونسل ،عقیدے اورقبیلے کی تفریق نہیں
اپنی نظروں میں دنیا کا ہر انسان مکرم ہے
ایک حکم حاذق ایسا بخشا ہم کو اللہ نے
جس کے پاس شفاکاشہدہے اوردعا کی مرہم ہے
زخم ہرے ہوتے رہتے ہیں ٹیسیں بڑھتی جاتی ہیں
آنکھیں خشک نہیں ہوتی ہیں قدسی کیساموسم ہے

غزل۔ساجد محمود رانا

دُکھ درد پہ رونے کی اجازت نہیں ہوتی
زنداں میں میسّر یہ سہولت نہیں ہوتی
ممکن تھا کہ صحرا سے پلٹ کر نہیں آتے
گر شہر منافق سے محبت نہیں ہوتی
یوں ہے کہ تیرا ہر ایک ظلم سہہ لیا میں نے
یوں ہے کہ محبت میں شکایت نہیں ہوتی
حیرت ہے کہ سرصبح چراغوں سے ہوں لڑتا
حیرت ہے سب غم کی وضاحت نہیں ہوتی
ماتھے پے سجاتا میں تیرے وصل کا جھومر
اے کاش تیرے ہجر کی عادت نہیں ہوتی
جس دن سے میرے ساتھ دغا تونے کیا ہے
اس دن سے کسی بات پہ حیرت نہیں ہوتی
آئینے میں اب کوئی بھی ہنستا نہیں مجھ پر
اب مجھ کو میرے حال سے وحشت نہیں ہوتا
جس دل پہ تیرے ہجر نے ڈھائی ہوقیامت
اُس دل پہ کبھی برپا قیامت نہیں ہوتی
تھم جائیں میری آنکھ سے بہتے ہوئے آنسو
کیا عشق میں اتنی بھی رعایت نہیں ہوتی
اک میں جو تیرے واسطے سے دنیا سے جدا ہوں
اک تو جسے دنیا سے ہی فرصت نہیں ہوتا
گر مجھ کو تیرے ہجر کی دولت نہیں ملتی
اس طرح میرے نام کی شہرت نہیں ہوتی
اے دوست وضو اشک ندامت سے ہے لازم
منظور وگرنہ یہ عبادت نہیں ہوتی
میں یاد کروں اور چلا آئے وہ ملنے
اس دور میں کیا ایسی کرامت نہیں ہوتی
جب تیز ہوا پیار کی آنکھیں ہیں دکھاتی
کمزور پرندوں سے بغاوت نہیں ہوتی

غزل۔انجم شہزاد (لندن)

میرے حقوق کو پائمال کرنے والے ہیں
فقیہِ شہر کوئی چال چلنے والے ہیں
ہمیں نے دُکھ کے الاؤ میں ہاتھ ڈالا ہے
ہمیں سے درد کے رشتے نکلنے والے ہیں
کسی نے چھین لیا ہے کسی کی آنکھ کا نُور
کسی کے ہاتھ سے دو ہاتھ کٹنے والے ہیں
میرے لہو میں ہیں شامل محبتیں، تیری
چراغ جن سے وفاؤں کے جلنے والے ہیں
ٹھہر سکو تو ذرا مُڑ کے دیکھ لینا انہیں
وہ لوگ جو کہ تیرے ساتھ چلنے والے ہیں

غزل۔پروفیسر شاہد اقبال (لندن)

لی میرے احساس نے کروٹ تو پھر یاد آ گیا
درد بن کر وہ میرے دل کے جہاں پر چھا گیا
کون لکھ کر چل دیا ہے ریت پر اک داستاں
کس کے دل پر وقت پھر ایسی قیامت ڈھا گیا
جیسے انساں چاہتا ہے ایسا تو ہوتا نہیں
کون اس سنگدل زمانے سے مرادیں پا گیا
تشنہ لب مانگے تو مانگے ریت کے صحرا سے کیا
دور تک جا کر میرا دل لوٹ کر پھر آ گیا
ایک ایک چہرے کے پیچھے ہے چھپی اک داستاں
شاید درد کا ہے اک سمندر وہ مجھے سمجھا گیا

غزل۔فوزیہ مغل (جرمنی)

بات نہ اُس نے مانی ہے
نہ میں نے ہی منوانی ہے
چلے جس پر عمر بھر
اب وہ رہ انجانی ہے

جب بینائی کھو بیٹھے ہم
تب یہ دنیا پہچانی ہے
اس دامن میں سب کانٹے ہے
اور آنکھوں میں ویرانی ہے
ہر دل کا کاغذ کورا ہے
ہر چہرے پر حیرانی ہے
تم رہ لو جب تک رہنا ہے
یہ دنیا آخر فانی ہے

غزل

ڈاکٹر منور احمد کنڈے (ٹیلفورڈ)

گہرے ہیں دل کے زخم بہت عاشقی کے ساتھ
منسوب بے وفائی ہوئی دوستی کے ساتھ
پھولوں کی منزلوں میں ہے کانٹوں کی راہگزار
دیکھو برہنہ پا ہوں میں دیوانگی کے ساتھ
لگنے کو لگ رہا ہوں میں تنہا مگر نہیں
یادوں کا ربط گہرا ہے اس زندگی کے ساتھ
پتھر نہ پھینک مجھ پہ کہ پاگل نہیں ہوں میں
یہ چاک ہے گریباں گر دل لگی کے ساتھ
میں سلام اس کو سر راہ کر لیا
بہتان کیا اٹھائے ہیں سادہ دلی کے ساتھ
دل کے چمن میں ایسے منور ہیں خار و گل
ہمراہ یاس و رنج ہوں جیسے خوشی کے ساتھ

غزل

محمد فاروق نسیم (برمنگھم)

وہ دور اب کہاں رہا چنگ و رَباب کا
رہ رہ کے یاد آتا ہے عالم شباب کا
کیا جانے کیا زبان سے اس کے نکل گیا
تانتا لگا ہوا ہے سوال و جواب کا
جو کچھ بھی جس کو کہنا تھا ، اُس نے تو کہہ دیا
ہے انتظار مجھ کو بس اُن کے جواب کا
کیا کھویا ہم نے عشق میں برباد کیا کیا
دھڑ کا لگا ہوا ہے حساب و کتاب کا
جاڑے کی سرد رات میں ہے چاندنی بہت
لیکن ہے انتظار ہمیں آفتاب کا
پانی کی جستجو میں تھے سب اہلِ کارواں
صحرا میں دلفریب تھا منظر سَراب کا
جیسے ہی آنکھ لگتی ہے آتے ہیں خواب بھی
اک سلسلہ طویل ہے راتوں میں خواب کا
اتنی حسین رات میں کیوں نیند آ گئی
ہم دیکھنے نہ پائے حُسن ماہتاب کا
بچھڑے جو کارواں سے تو منزل نہ مل سکی
پوچھا کسی نے حال نہ خانہ خراب کا
دنیا کی فکر چھوڑ نظر آخرت پہ رکھ
ہوتا نہیں زمیں پہ نشیمن عُقاب کا
بدمست زندگی تو مناسب نہیں نسیمؔ
کیا تم کو ڈر نہیں ہے خدا کے عذاب کا

غزل - فرزانہ نیناں (نوٹنگھم)

روز دیکھا ہے شفق سے وہ پگھلتا سونا
روز سوچا ہے کہ تم میرے ہو، میرے ہونا
میں تو اک کانچ کے دریا میں، بہی جاتی ہوں
کھنکھناتے ہوئے ہمراز مجھے سن لو نا
کان میں میں نے پہن لی ہے تمہاری آواز
اب مرے واسطے بیکار ہیں چاندی سونا
میری خاموشی کو چپکے سے سجا دو آ کر
اک غزل تم بھی مرے نام کبھی لکھو نا
روح میں گیت اتر جاتے ہیں جیسے خوشبو
گنگناتی سی کوئی شام مجھے بھیجو نا
چاندنی اوس کے قطروں میں سمٹ جائے گی
تیرگی صبح سویرے میں کہیں کھو دو نا !
پھر سے آنکھوں میں کوئی رنگ سجا لے نیناںؔ
کب سے خوابوں کو یہاں بھول گئی تھی بونا

غزل - ہما خان (برمنگھم)

دل چھوٹا نہ کرنا
ماں مجھ کو اسکول ہے جانا
میرے کھلونے تم رکھ لینا
جب میں واپس آ جاؤں گا
تو بھائی سے مل کر ان سے کھیلوں گا
بہنوں کا میں مان بنوں گا
میں مجھ کو اسکول ہے جانا!!
ہاں یاد آیا پیاری ماں!
میں اسکول سے نہ آؤں تو
میرے کھلونے میرے بھائی کو دے دینا
مجھے خون میں ڈوبا دیکھو تو ہنس دینا
اتنا سمجھنا
میں مٹی سے سرخ گلاب میں بدل گیا ہوں
میری خوشبو سے اس گھر کو مہکا لینا
دل چھوٹا نہ کرنا
دل چھوٹا نہ کرنا

کہہ دیتے ہو امریکہ

عبدالمجید ظفرؔ

خوابوں میں بھی امریکہ خیالات میں امریکہ
ہر جرمِ ضعیفی میں آفات میں امریکہ
تعمیر و ترقی ہو یا خارجہ پالیسی
میری قوم اور ملت کی ہر بات میں امریکہ
کمزور بہت ہو تم بیمار بھی لگتے ہو
چہرے پہ نہیں رونق بے زار بھی لگتے ہو
نہ کام اور دھندہ ہے بے کار بھی لگتے ہو
پوچھیں جو وجہ اس کی کہہ دیتے ہو امریکہ
اللہ کی رسی کو کیوں ہاتھ سے چھوڑا ہے
باغی ہوئے اور ناطہ شیطان سے جوڑا ہے

اللہ ہے خفا تم سے منہ اس لئے موڑا ہے
پوچھیں جو وجہ اس کی کہہ دیتے ہو امریکہ
جو دین سکھاتے تھے وہ علم سے عاری ہیں
گفتار ہے زہریلی الفاظ بازاری ہیں
حق گوئی سے بے بہرہ باطل کے حواری ہیں
پوچھیں جو وجہ اس کی کہہ دیتے ہو امریکہ
ہے شوقِ کفر سازی خُو فتوے لگانے کی
امت کی اکائیوں کو آپس میں لڑانے کی
ممبر پہ کھڑے ہو کر سلوات سنانے کی
پوچھیں جو وجہ اس کی کہہ دیتے ہو امریکہ
ہر مُلکِ مسلماں میں یوں دست وگریباں ہیں
شہہ زور کے ہاتھوں سے کمزور پریشاں ہیں
اخلاق و وفاداری الفت سے گریزاں ہیں
پوچھیں جو وجہ اس کی کہہ دیتے ہو امریکہ
دنیا میں ہوئے رسوا عظمت کے طلبگارو
تم اپنے ہی پاؤں پر کلہاڑی جو خود مارو
جس حال کو پہنچے ہو اس حال کے حق دارو
پوچھیں جو وجہ اس کی کہہ دیتے ہو امریکہ
ہر ہاتھ میں اسلحہ ، خونخوار ارادے ہیں
مذموم ارادوں پر کیا خوب لبادے ہیں
شیطان ہیں چڑھ دوڑے ابلیس پیادے ہیں
پوچھیں جو وجہ اس کی کہہ دیتے ہو امریکہ
نا حق انسانوں کا کیوں خون بہاتے ہو
معصوم جوانوں کو بمبار بناتے ہو
اقدار و ناموس اپنا مٹی میں ملاتے ہو
پوچھیں جو وجہ اس کی کہہ دیتے ہو امریکہ
ترسے ہوسکوں کو تم نہ امن و اماں حاصل
دنیا میں ہوئے رسوا توقیرِ زیاں حاصل
بکھرا ہے شیرازہ یوں کہ آہ و فغاں حاصل
پوچھیں جو وجہ اس کی کہہ دیتے
ایماں میں ملاوٹ ہے بزنس میں نفع خوری
کرتے ہو ذخیرہ تم دھوکہ سے کبھی چوری

دولت کا جمع کرنا افراد کی کمزوری
پوچھیں جو وجہ اس کی کہہ دیتے ہو امریکہ
ہر قومی ادارے میں بزنس میں خسارہ ہے
سرکاری اثاثوں پر شرفاء کا گزارہ ہے
چندلوگوں کے ہاتھوں میں ملّت کا ستارہ ہے
پوچھیں جو وجہ اس کی کہہ دیتے ہو امریکہ
کیوں غور نہیں کرتے اس حالِ خرابی پر
تقسیم شیعہ سنی دیوبندی وہابی پر
مَسلک اور مسجد کی تفریقِ شتابی پر
پوچھیں جو وجہ اس کی کہہ دیتے ہو امریکہ
تقویٰ وطہارت سے ایمان سے دوری ہے
اپنا ہو کہ بیگانہ انصاف سے دوری ہے
مثاقِ مدینہ سے مساوات سے دوری ہے
پوچھیں جو وجہ اس کی کہہ دیتے ہو امریکہ
مخلوقِ خدا کے تم مفادات سے غافل ہو
تعمیر و ترقی کے حالات سے غافل ہو
قدرت کے نشانوں سے کرامات سے غافل ہو
پوچھیں جو وجہ اس کی کہہ دیتے ہو امریکہ
کہتے ہو زباں سے جو اعمال نہیں ایسے
حق گوئی شرافت کا فقدان ہوا جیسے
گمراہ ہیں اگر رہبر افراد بھی ہیں ویسے
پوچھیں جو وجہ اس کی کہہ دیتے ہو امریکہ
اللہ پر یقیں رکھ کر تم مانگو دعائیں
مشکل جو پڑی ہے اُس کو ہی بتائیں
قادر ہے وہی آخر ٹالے گا بلائیں
پوچھیں جو وجہ اس کی کہہ دیتے ہو امریکہ
اغیار کو چھوڑو اب خود کرکے دکھاؤ
بکھرے ہوئے فرقوں کو اک قوم بناؤ
کسی مردِ خدا کی تنظیم میں آؤ
جینے کا جہاں میں آئے گا سلیقہ
کیوں جھوٹ کی راہ لے کر کہہ دیتے ہو امریکہ

غزل۔ مرسلہ: زکریا ورک کینیڈا

ہمارے ساتھ والے گھر میں لگتا ہے دیوالی ہے
در و دیوار پر یہ رنگ و آرائش مثالی ہے
لگا ہے باغباں بھی رات دن اس کی سجاوٹ میں
نئے پودے لگے مہکی ہوئی پھولوں کی ڈالی ہے
ہے مہمانوں سے رونق کس قدر ان کے یہاں دیکھو
یہ خالہ ہیں یہ خالو ہیں یہ سالا ہے یہ سالی ہے
کوئی گھر میں ہی گھنٹوں لگی ہے آپ میک اپ میں
تو کوئی پارلر میں دوپہر سے یرغمالی ہے
عزیز و رشتہ دار آئے ہوئے ہیں دور سے سارے
سمندر پار کر کے ساس بھی آنے ہی والی ہے
بہت مسرور و شاداں ہیں ادھر جس پر نظر ڈالو
چمک آنکھوں میں اور گالوں پہ لالی ہے
کچن سے آ رہی ہے اشتہا آمیز جو خوشبو
ابھی تھالوں میں باورچی نے بریانی نکالی ہے
چھلانگیں مارتی پھرتی تھی جو کل تک محلے میں
کہا کرتے تھے تم لگتا ہے یہ شیطاں کی سالی ہے
بڑے ناز ونعم سے پالا ہے جس کو پڑوسن نے
اسی نٹ کھٹ سے بلی کو ولادت ہونے والی ہے

ایک شاعر تھا جس کے متعلق مشہور تھا کہ وہ فی البدیہہ شعر کہتا ہے۔ جو کہہ دو کہہ دیتا ہے۔ ایک بادشاہ نے فیصلہ کیا کہ دیکھیں وہ واقعی اتنا عمدہ شاعر جتنا کہ سنا ہے۔ بادشاہ نے شاعر سے کہا میں تین آوازیں نکالتا ہوں اس کے اوپر شعر کہو۔ لالا ، لؤلؤ، لی لی

شاعر نے کھڑے پاؤں کہا

رآیت ظبیا علی کیئب یجعل القمر و الھلالا
فقلت ما اسمك فقال لؤلؤ، فقلت لی فقالی لالا

میں نے ایک خوبصورت ہرن دیکھا جو بہت ہی پیارا تھا، وہ ریت کے ٹیلے پر کھڑا بہت ہی پیارا ہرن، وہ اتنا خوبصورت تھا کہ اپنی خوب صورتی میں پورے چاند کو شرمارہا تھا اور پہلی رات کے چاند کو بھی، بدر کو بھی اور ہلال کو بھی۔ میں نے کہا تمہارا نام کیا ہے؟ کہنے لگا... لؤلؤ) موتی میں نے کہا میرے لئے؟ فقلت لی) کہنے لگا... لالا نہیں نہیں

نیشنل ایکشن پلان اور سیاسی لیڈران

(اے آر راجپوت لندن)

نیشنل ایکشن پلان جب سے وجود میں آیا ہے سوائے فوج کے اسے کسی نے درخورِ اعتنا نہیں سمجھا۔اُس وقت تو سب پارٹیوں نے اس کی تائید میں ہی اپنی بھلائی چاہی تھی ۔مگر اب ان سیاسی لیڈروں کی منافقت عیاں ہو چکی ہے ۔در اصل کالعدم تنظیموں کے بنانے والے،اُن کو گائیڈ کرنے والے یہی سیاسی لیڈر ہیں۔جیسے ضیاء الحق کے دور میں جب جہادیوں کے لیے بے انتہا ڈالرز اور ریال آیا،مدرسے کھولے گئے، جمعراتی مُلاں نے وہابیت کے نام پر دولت کو پوجا،اسلحے کی فیکٹریاں لگیں ،مذہبی انتہا پسندی کی آڑ میں جاہل ملاں کو سیاسی اشیر بادملی ،جہاد افغانستان کے بعد پھر فوج کی منصوبہ بندی سے طالبان وجود میں آئے ،جسے بے نظیر مرحومہ بھی کہتی تھیں کہ ’’طالبان ہمارے بچے ہیں اُسی وقت یہ عام لوگ سیاستدان بنے اور یہ جمعراتی ملاں نے جبہ پوش علمائے سو کا روپ دھار لیا۔اب دہشتگرد اور انتہا پسندی کو پینتیس سال بڑھاوا دیا گیا۔ اب اسے جو بھی ختم کرنے کوشش کرے گا۔اس کی روزی روٹی بھی جائے گی،اور عزت بھی۔جب سے نیشنل ایکشن پلان کا اعلان ہوا ہے۔

پھر NECTA وجود میں آئی ۔جس کے سربراہ کی تقرری میں لیت ولعل ہوتا رہا، سیاست دان نیشنل ایکشن پلان کے معاملہ میں بالکل سنجیدہ نہیں ،فوج نے تو بولڈ ایکشن لئے مگر سیاستدان اپنے اقتدار کو طول دینے کی خاطر ٹال مٹول سے کام لے رہا ہے ،کیونکہ اسے کل کلاں پھر ان انتہا پسندوں کی ضرورت رہے گی ،کوئی نہ کوئی بندہ مروانا ہوتا ہے،کسی دشمن کو اغوا کرانا ہوتا ہے،کل کلاں کشمیر کے لئے ضرورت پڑ جائے تو انتہا پسندی کا بیج بالکل ختم کر کے ہم کہاں جائیں گے ۔NECTA کی پرفارمینس تشویشناک حد تک مایوس کُن ہے ۔جب بھی دیکھو اس کی website under construtionرہتی ہے ۔اس پر کالعدم تنظیموں کی فہرست تک دکھائی نہیں جا سکی ۔جبکہ جہادیوں کی ،انتہا پسندوں کی website مسلسل کام کر رہی ہیں ۔اُن کا لٹریچر موجود ہے بلکہ نفرت انگیز لٹریچر دھڑا دھڑ شائع ہو رہا ہے ۔کسی صوبے میں اس پر کوئی کام نہیں ہو رہا ،ابھی سانحہ جہلم فیکٹری تازہ مثال آپ کے سامنے ہے ۔مگر جو کالعدم تنظیمیں ہیں کراچی میں اُن سے ٹیبل ٹاک بھی ہو رہی ہے،حکومت بالکل اس معاملہ میں سنجیدہ نہیں،جس نے اپنے وزارت خارجہ اور دفاع کو عارضی بنیادوں پر چلا رکھا ہے وزیر اعظم اپنی مرضی کے معاملات کو زیر بحث لاتا ہے ،ابھی تک افغان پالیسی ،اور انڈیا Discuss نہیں ہوا۔کیونکہ امریکہ افغانستان ،پاکستان ایک پیج پر نہیں تھے ۔ نیشنل ایکشن پلان کی طرف کسی کی کوئی توجہ نہیں سوائے فوج کے۔نفرت پھیلانے ،اور مساجد میں نفرت انگیز خطبات دینے ،لائڈ اسپیکرز کا غلط استعمال پر ۳۶۰۰ تین ہزار چھ صد مقدمات درج ہو چکے ہیں ،درجنوں نام نہاد آئمہ مساجد کو نفرت پھیلاتے پایا گیا ہے ۔وزیر داخلہ چوہدری لال مسجد کے دہشت گرد ملاں عبدالعزیز داعش کا محافظ ہے ۔(اُدھر اسلامی نظریاتی کونسل کے شیرانی اور شرابی گتھم گتھا ہو رہے ہیں ۔)

پولیس کو ان کے خلاف کچھ کرنے نہیں دیا جا رہا ،کیونکہ اُن گماشتوں کا بھی کوئی نہ کوئی رانا ثناء اللہ جیسا پروردہ ہے ۔کوئی خرم دستگیر ہے جو ان انتہا پسندوں کی دستگیری کرتا ہے ۔جسے اُن انتہا پسندوں کی الیکشن ،اور دنگا فساد میں گاہے گاہے ضرورت پڑتی ہے ۔اگر اپنے اپنے گماشتوں کا خیال یہ سیاسی لیڈرز نہ رکھیں تو وہ انتہا پسند یا دہشت گرد بھی زائد رقم لے کر اپنے گروہ یا پارٹی بدلنے کا حق محفوظ رکھتے ہیں ۔یہ منافقت ہماری اس رُو بہ زوال قوم کا طرہ امتیاز ہے،فوج سے یہ سیاسی لیڈر خوفزدہ ہیں ۔اور ذہنی طور پر یہ فوج سے متفق نہیں لکہ اعلیٰ قسم کے منافق ہیں ۔غدارِ وطن ہیں ،ملک کی دولت کو بیرون ملک لے جانے والے ہیں ۔بعض تو RAW کے وظیفہ خور ہیں ۔یہ انتہا پسندی ،اور شکم پروری ،حرام خوری ،ان کی نس نس میں گھر کر چکی ہے ۔جب تک یہ مائنڈ سیٹ تبدیل نہ کیا گیا ،مدرسوں میں مسلک ،فرقہ پرستی ،کی بجائے قرآن یا اور دنیاوی تعلیم دینے کا نظام نہ متعارف کرایا گیا تو یہ مدرسے کا فرفیکٹریوں کا کردار ادا کرتے رہیں گے ۔جاہل مُلاں اس قوم کے سر پر سوار ہو چکا ہے ۔

اس جاہل مُلاں کو اس قوم نے اپنے مذہوم مقاصد کے لئے استعمال کیا ہے ۔کبھی اس جاہل کو کشمیر،افغانستان ،کبھی لال مسجد ،کبھی فرقہ پرستی ،کبھی فلسطین ، کے نام پر جہاد کی ترغیب دے کر جنت کا جھانسہ دیا گیا ہے اور پھر کبھی جہاد کو محدود کر کے جہاد بالنفس کا چکر دے کر جنگ سے منع کیا جاتا رہا ہے ۔ہماری اس دوغلی پالیسی نے قوم کو بھی اور ملک کو بھی بلکہ عوام کو بھی کہیں کا نہ چھوڑا ہے ۔ہمارے ہاں ابھی تک لیڈر کی تلاش ہے ،گیدڑ تو بہت ہیں مگر لیڈر نہیں آج تک نہ ملا۔جناح صاحب کے بعد اور جناح نہیں پیدا ہوا۔ہمارے لیڈر مغرب کے اور سعودیہ کے غلام ہیں ۔ازل سے غلام ذہنیت کا شکار رہے ہیں ۔ایٹم بم تو بنا لیا مگر اندر کے انسان کو حقیقی انسان بلکہ باخدا انسان بنانے میں آج تک ناکام رہے ۔اس قوم کی اندوہ ناک بلکہ شرمناک ناکامیاں اس کی تاریخ میں ایک سیاہ دھبے سے کم نہیں ۔اب بھی یہ سیاسی لیڈر اپنے سیاہ کرتوتوں کو چھپانے کے چکر میں فوج سے خائف ہیں ۔ہمارے عام درمیانے درجے کے سیاسی لیڈر کی خواہش یہ ہے دو پجارو،دو کوٹھیاں ،بیس کتے ،دو گھوڑے ،کار پر جھنڈا ،ہاتھ میں کلاشنکوف ،ہاتھ اُٹھا کر ہر کوئی سلام کرے ،پٹواری اور تھانیدار گھر آ کر انتقال اور مقدمات درج کریں ۔قرآن و اسلام ،نماز سے یہ سرکاری مسلمان نابلد ہیں ،ایسی عزت کے خواہاں ہیں ۔قومی مستقبل کی نیشنل ایکشن پلان کی ان کو کوئی ضرورت نہیں ،یہ سب کام پاک فوج کے کرنے کے ہیں کیونکہ اُسے نہ ووٹ کی ضرورت ہے نہ نوٹ

کی۔اگر تاریخ کو کھنگا لا جائے تو ہندوستانیوں نے ہمیشہ بیرونی حملہ آوروں کو بڑی خوشی سے اپنے حکمران کے خلاف خوش آمدید ہی کہا ہے۔اب بھی ایسا ممکن ہے کیونکہ ہم اور ہمارے لیڈر پٹڑی سے اُتر چکے ہیں ملک کی باگ ڈور نادان بچوں کے ہاتھ میں مثل قینچی کے آچکی ہے۔ملک کے مردہ جسم کو گدھوں کی طرح نوچا جا رہا ہے۔اور حکمران بڑے بڑے پی آئی اے جیسے اداروں کو اپنی اقرباء پروری کی بھینٹ چڑھا نے پر اُدھار کھائے بیٹھے ہیں اور نیشنل ایکشن پلان کو پسِ پشت ڈال کر اپنی حکومتی اقتدار کو طول دینے کے چکر میں ہیں۔سندھ میں تو حکومت بھی نیشنل ایکشن پلان کی صف لپیٹنے کے چکر میں ہے۔اب پٹھان کوٹ ائر پورٹ حملے کے بعد باسی کڑی میں اُبال آیا ہے۔شاید بھارت کو راضی کرنے کے لئے مولانا مسعود اظہر کے بھائی کے مدرسے پر سیالکوٹ میں چھاپہ مارا گیا ہے۔شاید اسی بہانے پنجاب حکومت اسی ملائیت کی نحوست کو اپنے صوبے سے ختم کردے بلکہ ناممکن ہے۔یہ کینسر سارے خون میں سرایت کر چکا ہے حکومت پنجاب تو اس دہشت گردی کو ایمان کا درجہ دے بیٹھی ہے۔اور آئندہ الیکشن کی منصوبہ بندی ان انتہا پسند ملاں سے کروا رہی ہے۔ادھر بلاول کو بھی اب یاد آیا ہے جب حکومت نے ڈاکٹر عاصم پر ہاتھ ڈالا ہے۔بلاول کہتا ہے کہ پانچ سال قبل جن تنظیموں پر پابندی لگائی گئی تھی۔اب ان کے مدرسوں پر چھاپے مارے جا رہے ہیں۔اسے نہیں معلوم کہ پنجاب حکومت ہے ہی انتہا پسندوں کی جسے رائے ونڈ مدرسوں سے ہی مشورے آتے ہیں۔مولوی نواز شریف کا خطاب زرداری نے کیوں دیا تھا۔پنجاب حکومت کے پیٹ میں داڑھی ہے۔سارے پنجاب میں ان ہی کے کارندے دہشت گردی کے مدرسے چلا رہے ہیں۔پیپلز پارٹی کو ان ملاؤں نے ہی ناکام کیا ہے۔کچھ اس کی اپنی پالیسیوں نے بھی۔سینکڑوں مدرسوں کا ابھی تک وزیر داخلہ آڈٹ تک نہ کروا سکے۔خدا ہماری قوم پر رحم کرے۔یہ جتنی مدت میں بویا گیا ہے اب اُس سے دوگنی مدت اسے تلف کرنے کے لئے درکار ہے۔خدا تعالی اس ملک پر رحم کرے۔آمین۔

افسوس

ہمیں تو اپنوں نے لوٹا غیروں میں کہاں دم تھا
میری ہڈیاں وہاں ٹوٹی جہاں ہسپتال بند تھا
مجھے ایمبولینس میں بٹھایا جس میں پٹرول کم تھا
مجھے رکشے میں اس لئے بٹھایا کہ اس کا کرایہ کم تھا
مجھے ڈاکٹروں نے اُٹھایا نرسوں میں کہا ں دم تھا
مجھے اُس بیڈ پے لٹایا جس کے نیچے بم تھا
مجھے بم سے اُڑایا گولی میں کہاں دم تھا

ڈاکٹر سلطان محمود شاہد مرحوم

ڈاکٹر پرویز پروازی

اپنے شاہ جی ڈاکٹر سید سلطان محمود شاہد کی سناؤنی بھی آ گئی۔جو بادہ کش تھے پرانے وہ اٹھتے جاتے ہیں۔کئی دنوں سے ان کی علالت کی خبریں ای میل پر چل رہی تھیں۔دوست احباب شاگرد سب ان کے لئے دعائیں کر رہے تھے۔مگر ہونی تھی ہو کر رہی اس پر کسی کا بس نہیں۔نہ انکی علالت کی تفصیل کا علم ہے مگر انجام سے تو کوئی بے خبر نہیں۔آخر کو یہی ہونا تھا۔اللہ تعالیٰ نیک نفس،متواضع،نافع الناس اور متوکل وجود کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے۔کچھ دن پہلے ایم ٹی اے پر شاہ جی کا کوئی پرانا انٹرویو چل رہا تھا۔اس میں بھی وہ کمزور اور ناتواں سے لگے۔مگر ہم نے عمر کا تقاضہ ہی جانا مگر ان کی شخصیت کا بانکپن اس انٹرویوں میں نہیں تھا۔وہ انٹرویوں دیکھ کر دل سے دعا نکلی اے باری تعالیٰ ہمارے کالج کے زمانے کے شاہ جی ہمیں لوٹا دے۔وہ ہنستے بولتے شاہ جی جو طلباء میں رفقاء میں یکساں مقبول تھے۔جدھر سے گذر جاتے تازہ ہوا کا جھونکا گزر گیا ہے۔ڈاکٹر سید سلطان محمود شاہد کالج کی قدیمی اساتذہ میں سے تھے۔قادیان کے زمانہ سے شاہ جی کے سٹاف پر آ گئے تھے۔پھر ربوہ میں تو کالج کے قومیائے جانے تک سٹاف پر رہے اور اسی ''جرم'' کی سزا پائی۔مگر ان کے پائے استقلال میں کوئی لغزش نہیں آئی۔

ہم نے شاہ جی کو کالج میں داخل ہونے سے پہلے زمانہ سے جاننا شروع کیا کیونکہ ان کی سائینس کی درسی کتابیں یونیورسٹی کے نصاب میں شامل تھیں اور علمی حلقوں میں ایس ایم شاہد انام بڑا تھا اور سارے پنجاب میں ایک ہی یونیورسٹی تھی پنجاب یونیورسٹی جس میں ان کی درسی کتابیں سبقاً سبقاً پڑھائی جاتی تھیں اس لئے سائنس پڑھنے والے طلباء سب سے پہلے جس نام سے آشنا ہوتے وہ ایس ایم شاہد کا نام تھا۔سائنس میں ہمیں مناسبت کسی زمانہ میں بھی نہیں رہی مگر سائینس والوں کے ساتھ ہمارے تعلقات ہمیشہ خوش گوار رہے۔ہمارے دوستوں میں سائینس پڑھنے پڑھانے والے بہت تھے۔پھر ہمارے کالج کے سائنس پڑھانے والوں میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ہمارے یونیورسٹی کے ایک مرحوم استاد کیمسٹری والوں سے بہت چڑتے تھے۔ان کا مقولہ تھا کہ ہمہ وقت بدبو میں گھرے رہنے والا کیمسٹری کا استاد کبھی خوشبودار بات برداشت کر سکتا ہے نہ کر سکتا ہے۔خدا معلوم ان کو یہ تجربہ تلخ کیوں تھا۔مگر ہمارے کیمسٹری والے اساتذہ خان حبیب اللہ خان ہوں یا ایس ایم شاہد یا اپنے مبارک انصاری صاحب پھولوں کی طرح مہکتے رہتے تھے۔جدھر جاتے ان کی شخصیت کی خوشبو دور دور تک پھیل جاتی تھی۔اب ان کیمسٹری والوں میں صرف استاذی مبارک

احمد انصاری رہ گئے ہیں یا ان کے بھائی رفیق احمد ثاقب۔ اللھم متعنا بطول حیاتھم۔

ہم نے پہلی بار اس مشہور و معروف آدمی کو ربوہ میں دیکھا تو ذرہ یقین نہ آیا کہ وہ یہی مشہور و معروف پروفیسر ہے جس کی کتابیں یونیورسٹی کے نصاب میں شامل ہیں اور لوگ پڑھتے پڑھاتے ہیں۔ ہم نے یہ دیکھا کہ سادہ کپڑوں میں ملبوس ایک نوجوان سا آدمی ایک ننی منی سی بیٹی کی انگلی پکڑے سبزی خرید رہا ہے کوئی اکڑفوں اس میں نہیں کہ پروفیسر ہے اور مشہور پروفیسر ہے۔ وہ ننی منی بیٹی ہمارے محلے میں پلی بڑھی اور پھر اپنے ابا کے سکول کی پرنسپل بنی۔ اس کے بھائی تو اللہ میاں نے بہت بعد میں دئے۔ شاہ جی کی بیٹی بشریٰ ہماری بڑی بیٹی کی ہم عمر ہے راشدہ شاہ جی کی لاڈلی بیٹی رہی ہے اور ہے اب آخیر بیماری میں بھی اس کے حوالے سے شاہ جی کی خیریت کی خبر ملتی تھی شاہ جی میں اور ہمارے درمیان ایک قدر مشترک بھی ہے قبلہ شاہ جی بھی اپنے لباس کی طرف سے لاپرواہ تھے جو ملا پہن لیا۔ محلہ میں تو ان کا یہی چلن تھا البتہ کالج میں بش شرٹ اور پتلون پہنتے تھے۔ کبھی کبھار سوٹ بھی زیب تن فرماتے تھے پی ایچ ڈی کرنے کے بعد کالج میں سب سے پہلے شاہ جی ہی لندن گئے واپس آئے تو خیال آیا کہ ڈاکٹر ایس ایم شاہد اب تو سوٹ بوٹ میں ملبوس نظر آیا کریں گے مگر نہیں شاہ جی وضع دار تھے اپنی وضع پر قائم رہے اپنے خرچ پر پی ایچ ڈی کرنے گئے تھے۔ اور اپنے حال میں مست رہے اور اپنا کام مکمل کر کے واپس آئے۔ وہاں ولایت میں بھی مشن ہاؤس سے رابطہ استوار رکھا اور باقاعدہ وقت دیتے رہے۔ اپنے مخصوص انداز میں اس زمانے کے واقعات سنایا کرتے تھے پھر مدتوں بعد اپنے بیٹے کو لندن یونیورسٹی میں داخلہ کروانے آئے تو مشن ہاؤس میں ملاقات ہوگئی ہم نے کہا شاہ جی جوانی کو یاد کرنے آئے ہیں؟ فرمایا دعا کریں یہ بچہ ہماری جوانی کے زمانے جیدے مسائل سے عہدہ برآ ہو سکے۔ مگر شاہ جی کے صاحبزادے شاہ جی کی طرح سختیاں جھیل نہ سکے ہوں گے غالباً پی ایچ ڈی تو نہ کر سکے کوئی چھوٹا موٹا ڈپلومہ ضرور لے گئے ہوں گے مگر ہمارا اُن سے رابطہ نہ رہا۔ شاہ جی جیسی اولوالعزمی اور ثابت قدمی وہ کہاں سے لاتے؟

کالج کے سٹاف ڈاکٹر سلطان محمود شاہد صاحب کافی سینئر سٹاف ممبر تھے کبھی کبھار پرنسپل کی قائم مقامی کرنی پڑتی تو پرنسپل کی کرسی پر یوں بیٹھتے جیسے زبردستی بٹھائے گئے ہوں۔ یہی حال میاں عطاء الرحمٰن صاحب کا تھا پرنسپل کی کرسی پر بیٹھتے ہوئے شرماتے تھے۔ کالج کے قومیائے جانے کے بعد شاہ جی پر بہت سختیوں کے زمانے آئے ادھر اُدھر تبادلے اُن کے مرتبے سے فروجگہ پر ان کی تعنیاتی ہوتی مگر جھیل گئے۔ حالانکہ کالجوں کے قومیائے جانے کے وقت ان کا شمار پنجاب کے سینیت ترین اساتذہ میں تھا۔ حق تلفی کے کڑوے گھونٹ انہیں بھی پینا پڑا۔ این ہم اندر عاشقی بالائے غم ہائے دگرد۔ اس زمانہ میں آپ نے اسکول کی بنیاد ڈالی اور اس کو محکم ادارہ بنا دیا۔ غالباً ایک انٹر کالج بھی شاہ جی کھولنا چاہتے تھے شاید کھولا بھی ہو مگر وہ وہلوے کہاں وہ جوانی کدھر گئی؟ کا مضمون انسان کے ساتھ لگا ہوا ہے یہ ادارے کسی مالی منفعت کے لئے نہیں کھولے گئے ان کے اندر کام کرنے کی جو لگن تھی اور کچھ کر گذرنے کے جو دھن تھی یہ سب اس کا کرشمہ تھا کہ شاہ جی ضیف العمری میں بھی چین سے نہیں بیٹھے تھے۔

شاہ جی طبیعت کے دھیمے تھے۔ اپنے جونیئر سٹاف سے بات کرتے تو ان کا لہجہ اور زیادی دوستانہ ہو جاتا تھا۔ طلباء تو ان کے ساتھ گونہ بے تکلفی بھی برت لیتے تھے مگر ان کے ماتھے پر کبھی کوئی شکن نہ آتی۔ یونین کے انچارج تھے۔ عہدے داروں سے برابری کی سطح پر ملتے اور بات کرتے تھے۔ ہم نے کبھی ان کو طلباء کے بارے میں سختی کا رویہ اپناتے ہوئے نہیں پایا۔ اگر کوئی طالب علم کسی قصور کے سلسلہ میں ان کے سامنے پیش ہوتا۔ تو پہلے تو اُس کے ساتھ ہمدردی کرتے کہ ”بلّی! تم نے یہ کام کیوں کیا؟ یہ بلّی کا لفظ پنجابی کا بڑا پیارا آمیز لفظ ہے جس میں باپ کی شفقت بھی شامل ہے بڑے بھائی کا پیار اور سرپرست کی سرزنش بھی۔ پھر اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر بڑے پیار سے اسے سمجھاتے اور وہ شرمندہ ہو کر معافیاں مانگنے لگتا۔ ہم نے شاہ جی کو جرمانوں سے اصلاح کرتے نہیں دیکھا۔ پیار سے بے پرواہوں کو سیدھے راہ پر لاتے دیکھا۔ سائنس ہم نے ان سے پڑھی نہیں ان سے کیا کسی سے بھی پڑھی نہیں۔ اس لئے ان کی درسی یا غیر درسی کتب سے استفاذ کا موقعہ نہیں ملا۔ ہاں ہم نے شاہ جی سے طلبا کو رام کرنے کا ہنر سیکھا ہے۔ بچوں کو محبت دو گے تو محبت پاؤ گے۔ سٹاف میں شاہ جی کو دوستی تو سب سے تھی مگر بے تکلفی ایک دو دوستوں سے ہی تھی ایک تو اپنے ظفر احمد وینس تھے جو پی ایچ ڈی کرنے گئے تو کالج سے ہی گئے یا ان کے اور محلہ دار اپنے برادرم چوہدری حمید احمد سے تھی باقی دوستوں سے سٹاف میں اس طرح بے تکلف نہ ہوتے تھے اور تو اور ہمارے چوہدری عطاء اللہ صاحب فراسی والے بھی ان کے بے تکلف دوستوں میں سے تھے مگر چائے شاہ جی کو بھی نہیں پلاتے تھے۔ جس دن اپن شریف خالد مرحوم نے سٹاف روم میں اعلان کیا کہ انہوں نے سائیکل بیچ کر بھینس خرید لی ہے ظفر وینس صاحب نے بھتی کہی لوگو اب کل سے شریف خالد صاحب بھینس پر سوار ہو کر کالج آیا کریں گے ابھی یہ اعلان جاری تھا کہ شاہ جی کسی کام سے سٹاف روم میں آ گئے پوچھنے لگے کہ کیا اعلان ہو رہا تھا؟ ظفر صاحب نے کہا کہ شریف خالد صاحب نے سائیکل بیچ کر بھینس خریدی ہے اس کا تذکرہ ہے شاہ جی کہنے لگے خوش قسمت ہیں میں تو اپنی سائیکل بیچوں تو اس سے ایک بکری بھی نہ خریدی جائے۔ ظفر وینس صاحب کہاں چپ رہتے تھے کہنے لگے شاہ جی! یہ کام نہ کیجئے گا آپ بکر پر سوار ہو کر کالج نہ آسکیں گیں ہاں آپ کے بیٹے کے عقیقے میں ضرور کام آسکے گی۔ ہمارے کالج کے سٹاف روم میں اس طرح کا بے ضرر پاکیزہ مذاق چلتا رہتا تھا۔

کالج کے میگزین میں قبلہ شاہ جی کا ایک مضمون چھپا۔ اس مضمون نے کالج

میں قیامت برپا کر دی۔ مضمون تھا شادی کے بارے میں۔ اِدھر المنار چھپ کر آیا اُدھر شادی آگ بگولہ کہ شاہ جی کو ہمت کیسے ہوئی کہ وہ میرے بارے میں ''لکھیں'' شادی پرانے خیالات کا انپڑھ آدمی تھا اُس کو ناراض کرنے کو اتنی بات کافی تھی کہ کسی نے اُس کے بارے میں لکھا ہے اور وہ المنار میں چھپا ہے اُس کو خیال تھا کہ چھپتی وہی بات ہے جو اچھی نہ ہو ہم لوگوں نے بہتیرا سمجھایا کہ شادی شاہ جی نے تمہاری تعریف کی ہے اس کا جواب تھا تو کاغذ کالا کر کے میرا منہ کالا کرنے کی کیا ضرورت تھی اس معاملہ نے بہت طول کھینچا۔ شاہ جی کئی دن شادی سے منہ چھپاتے پھرے پھر ایک دن حضرت پرنسپل صاحب نے شادی کا غصہ رفع کیا اور شاہ جی کا قصور معاف کرایا مگر شادی کا دل بہت بعد کو جا کر صاف ہوا۔ شاہ جی فرمایا کرتے تھے شادی کی بے تکلفی کی بات کو جی ترس گیا خدا معلوم کب اس کا غصہ رفع ہوگا۔ ایک دب سٹاف میں شاہ جی بیٹھے تھے کہ شادی نے انہیں مخاطب کر کہ کہا اب دوبارہ نہ لکھنا شاہ جی کہ یہبات سن کر شاہ صاحب کی باچھیں کھل گئیں فرمانے لگے اب شادی کی ناراضگی دور ہوئی ہے۔ اور اٹھ کر شادی کو گلے سے لگا لیا۔ دونوں کے دل صاف ہو گئے تھے۔

ہمارے سائینس کے سٹاف کے ساتھ تعلقات کا دائرہ دوسرا تھا نصیر صاحب تھے یا بایولوجی والے حبیب الرحمٰن شاہ اور پروفیسر شریف خاں اس لئے شاہ جی ہمارے تعلقات اور محلہ داری کے رہے یا سینیئر سٹاف کے یونین کے ناطے سے بھی شاہ جی کی عدم موجودگی میں ہمیں کام کرنا پڑا ہمیں یاد نہیں پڑتا کہ شاہ جی نے کبھی تف بھی کی ہو۔ ادب کا بڑا صاف ستھرا ذوق رکھتے تھے مضمون وغیرہ بھی لکھتے تھے مگر ان کا میدان اور تھا۔ سرگودھا بورڈ کے سینیر ممتحن اور پرچے بنانے والے شاہ جی بھی تھے اور ہم بھی۔ اس سلسلے میں کبھی کبھار بورڈ کی میٹنگز میں ہم اکٹھے ہو جاتے تو بڑا لطف رہتا۔ شاہ جی تو اتنے سینئر تھے کہ امتحانی سینٹر کی انسپکشن کیلئے بھیجے جاتے تھے۔ شاہ جی آرام سے بسوں پر سفر کرتے ہوئے سنٹر میں جا پہنچتے۔ کسی کو گمان بھی نہ ہوتا کہ یہ سادہ سے لباس میں خراماں خراماں آنے والا شخص سنٹر کا انسپکٹر ہے۔

ایک بار خود اپنے کالج کے امتحانی سینٹر کے انسپیکٹر کے طور پر بھی مقرر ہوئے حالانکہ عام طور پر خود اپنے ہی کالج کے اساتذہ کو اپنے ہی کالج میں مقرر نہیں کیا جاتا۔ فیصل آباد کے ایک کیمسٹری کے استاد امتحانی سنٹر کے نگران تھے۔ اس نے شاہ جی کو ہال کے اندر آتے دیکھا تو سمجھا کہ شاہ جی از روئے مروت اپنے کیمسٹری کے رفیق کو ملنے آئے ہیں۔ مگر جب شاہ جی نے آتے ہی سینٹر کا ریکارڈ مانگا تو وہ حیران رہ گئے۔ شاہ جی نے پورا پورا معائینہ کیا اور کوئی رعایت روا نہ رکھی۔ ہاں عملی امتحان میں شاہ جی طلباء پر مہربان رہتے تھے۔ فرماتے تھے ہمارے ایک آدھ نمبر کی رخصت کی وجہ سے بچے کی ڈویژن متاثر ہو سکتی ہے۔ اسی لئے فراخ دلی کا مظاہرہ کیا کرتے تھے۔ اس لئے جس سینٹر میں شاہ جی جاتے وہاں کے لڑکے ان سے بڑے خورسند رہتے۔ مگر ناجائز رعایت انہیں نہ آتی تھی۔ نہ کرتے تھے نہ اپنے کالج میں آنے والے ممتحنوں سے توقع رکھتے تھے کہ وہ ان طلباء کو ناجائز رعایت دیں گے۔ تعلیم السلام کالج مفسل کے ان کالجوں میں سے تھا جو ہمیشہ سے پوسٹ گریجوایٹ کلاسوں کے شروع کرنے میں دلچسپی رکھتے تھے۔ چنانچہ عربی فیزکس کیمسٹری تین مضامین ایسے تھے۔ جن میں پوسٹ کریجویٹ کلاسوں کے آغاز کے انتظامات ہو رہے تھے۔

نئے کمپس میں فیزکس کے ساتھ اوپر کی منزل کیمسٹری کے پوسٹ گریجوائٹ کلاسوں کے لئے بنائی گئی تھی۔ یونیورسٹی یا حکومت کی جانب سے جتنے بھی کمشن کالج کی موزونیت کے معائینہ کے لئے آتے تھے۔ ان میں عربی فزکس اور کیمسٹری تینوں مضامین کے ماہرین شامل ہوتے تھے۔ اور ہر کمیشن کی متفقہ رپورٹ یہی ہوتی تھی کہ کالج میں مناسب عمارت، تربیت یافتہ سٹاف، لائبریری اور لیبارٹری موجود ہیں۔ اور تینوں مضامین کا سٹاف اپنے مرتبہ میں اعلیٰ درجہ کا ہے۔ عربی اور فزکس کی کلاسیں شروع ہو گئیں مگر کیمسٹری میں کوئی روک پڑ گئی۔ اور پھر کالج قومی تحویل میں آ گیا۔ اس کے بعد کا حال سب کے سامنے ہے۔ عمارتیں اور ادارے صرف اینٹوں کا نام نہیں ہوتے۔ اب تو اینٹیں بھی نہیں رہیں۔ پاکستان میں صرف تعلیم الاسلام کالج ہی ایسا ادارہ ہے۔ جس کو محض تعصب کی بنا پر قومی تحویل سے رہا نہیں کیا جاتا۔ ورنہ کئی ادارے واپس کئے جا چکے ہیں۔ اب نصیر خاں صاحب اور صوفی صاحب تو یہ غم لئے ہوئے اس جہاں سے گذر گئے۔ اب شاہ جی یہ داغ اپنے سینے میں لئے گذر گئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ بے لوث کارکنوں کی خدمات کا اجر ضرور دے گا انشاء اللہ۔ شاہ جی کا اٹھ جانا صرف کالج کے طلباء کیلئے ہی نہیں پاکستان کے نظام تعلیم کے لئے ایسا صدمہ ہے جسے مدتوں بھلایا نہیں جا سکے گا خدا کرے ان کی آل اولاد میں شاہ جی کی فروتنی علم دوستی اور مسکراہٹوں کی روایت قائم رہے۔

❁❁

عظیم منصوبہ ساز

کلاڈ ایم ہیتھ وے انجینئر لکھتا ہے:

اگرچہ شروع شروع میں خدا تعالیٰ کے بارے میں میرا علم سراسر تعقل پر مبنی تھا۔ اب خود میرا دل اس ذات کے وجود کی گواہی دینے لگا ہے اور اس نے عقلی و استدلالی شواہد کو میری نظر میں غیر اہم بنا دیا ہے۔ جن لوگوں کو اُن کا تجربہ نہ ہو اُن کے لئے ایسے تجربات ناقابل یقین یا ناقبل فہم ہوں۔ لیکن تجربے سے متمع افراد انہیں بالکل معقول خیال کریں گے۔ میں نے یہ معلوم کیا ہے کہ خدا ہی صرف ایسی ذات ہے جو انسانی روح کے تقاضوں کو پورا کر سکتی ہے۔

(خدا موجود ہے صفحہ 168 مرتبہ جان کلوور امونز مترجم عبدالحمید صدیقی مقبول اکیڈمی لاہور طبع چہارم)

حالاتِ وطن

(رانا عبدالرزاق خان لندن)

میرے وطن کا حال مت پوچھو
گھری ہوئی ہے طوائف تماش بینوں میں

میرے وطن میں انسان اخلاق باختہ ہوتا جارہا ہے روز بروز معیار بدتر سے بدتر ہوتا نظر آتا ہے۔ایلیٹ کلاس کا پہلے تو بھٹہ بیٹھا۔حقوق اللہ کی پامالی تو تھی ہی مگر اب انسانی حقوق کی پامالی تو آخری حدود کو چھونے لگ گئی ہے۔اَقرباء پروری کی بیماری اسقدر گھر کر گئی ہے کہ سب ہی اپنے مطلب اور بچاؤ کی خاطر ایک دوسرے کا خیال رکھنے لگ گئے ہیں۔مثلاً مفاہمتی اپوزیشن نے کیسے کیسے بڑے سکینڈلز کی فائلوں کے گلے دبادیئے۔بڑے بڑے رینٹل اور فراڈیئے وزراء اعظم اور صدور پر نیب کی نظر نہیں پڑ رہی،سب ہی ایک دوسرے کے کانے جو ہوئے،بیوروکریٹ تو ازل سے کرپٹ ٹھہرے۔اب یارلوگوں نے آنے والے جعلی ڈگری ہولڈرز وُزراء کی کھیپ کو ساتھ مل کھانے کے گُر سکھا کر کانے کرلیا ہے۔باقاعدہ ٹریننگ دی جاتی ہے۔کیسے کیسے ترقیاتی فنڈز،الاؤنسز،گرانٹس،کے حصے لینے اور دینے ہوتے ہیں۔یہ سب کرپشن ملاپ اور طریقے اور سلیقے سے ہوتی ہے۔

چاندی کی چمک نے ان کے ایمانوں کو زنگ آلود کر دیا ہے،جس ملک کا صدر بہت بڑا ٹن پرسنٹ اور ڈاکو رہا ہو اُس کی مسلم رعایا کیونکر سب کچھ نہ سیکھے گی۔جس ملک کے وفاقی وزیر جج،جج سکینڈل میں کرپشن میں پکڑے گئے ہوں تو باقی مسٹر ڈیزل پر کیا افسوس۔یہ جبہ پوش،پارلیمنٹ کے ممبران،جن کی حرکات سے پردہ ہٹایا جائے تو ابلیس بھی توبہ کرنے لگ جائے اور مستزاد یہ کہ یہی لوگ،لوگوں کے ایمانوں کے فیصلے کریں تو کیا یہ بوالعجبی نہیں۔کبھی طالبان بن کر نجات دہندہ بن بیٹھیں تو کبھی دہشت گرد بنکر جنت کے ٹکٹ فروخت کریں،جب زورِ خطابت پر آئیں تو شریف شہریوں کو اپنی مقبوضہ مساجد سے ننگی گالیوں سے نوازیں،مولانا شیرانی اور مولانا شرابی کے لڑائی نے اسلامی نظریاتی کونسل کے تقدس کا بھانڈا چوراہے میں پھوڑ دیا ہے۔

یہ علماء ہیں کہ جن کو دیکھ کر شرمائیں یہود،یہ کیا ہے۔اور حکومتِ وقت اس لئے چُپ سادھ لے کہ اُس کے ووٹرز ہیں۔بڑے بڑے گماشتے اغوا برائے تاوان کریں،سابق وزیراعظم کا بیٹا،اور سلمان تاثیر کا بیٹا مغوی ہو،اور کوئی بھی طاقت اُسے بازیاب کرانے کی جرأت نہ رکھتی ہو،کیا یہ ممکن نہیں،یا تو یہ ملی بھگت ہے یا کتی چوروں کے ساتھ ملی ہوئی ہے۔جنگلہ بس سروس اور اورنج ٹرین کے ذریعے اپنوں کو نوازا جارہا ہے اور بے چارے شہری نڈھال تماشہ دیکھ رہے ہیں۔غریب شہریوں کی جائیدادیں اونے پونے خرید کر بڑے بڑے گماشتے اپنی جیبیں بھر رہیں ہیں۔اپنے دُشمنوں کو پولیس مقابلے میں راتوں رات قتل کروا دیا جاتا ہے۔اور اگر رشوت،چور بازاری،لوٹ مار،ملاوٹ کی طرف دیکھا جائے تو انسان کی رُوح کانپ اُٹھتی ہے۔لگتا ہے کہ شریف اور منصف افراد اس دنیا سے کوچ کر گئے ہیں۔نہ انصاف ہے،نہ رحم ہے،نہ قانون کی پاسداری ہے،نہ اسلام کا زور چلتا ہے اور نہ ہی اسلام آبادکا،باہمی بداعتمادی کا سانپ سبھی کو ڈس گیا ہے۔فرقہ پرستی اور مذہبی انتہا پسندی نے ہر انسان کا ہر لحاظ سے امن لوٹ لیا ہے۔یہ سیاسی اور مذہبی جماعتیں بھی کوئی کردار ادا نہ کر پائیں۔ان کے دعوے اور منشور کہاں دفن ہو گئے۔ہر کوئی اپنی اپنی بنسری بجا رہا ہے۔جس کی لاٹھی اُسی کی بھینس ہے،انڈیا سے دوستی کرنے پر ہمارے وزیراعظم بضد ہیں جبکہ اس کی بغل میں چھری صاف نظر آرہی ہے۔

اب ذاتی دورے کو ہی اپنی بہت بڑی کامیابی سمجھ رہے ہیں۔لگتا ہے ہم گدھوں کا گوشت کھا کھا کر گدھے ہوتے جارہے ہیں اور پھر الیکٹ بھی اپنے جیسے بھائی ہی کو کرتے ہیں۔کوئی بھی محکمہ ایسا نہیں جہاں گدھا پن نہ کیا جاتا ہو۔اگر یہ گدھا پن نہ کیا جاتا تو آج پاکستان دنیا میں چین اور کوریا سے آگے ہوتا اور ساری دنیا میں اپنا مقام بنا چکا ہوتا،سنا ہے کہ پاک و ہند میں ان نام نہاد مدرسوں نے بہت علماء پیدا کئے۔مگر پاکستان تو دوسو سال کی غلامی کے بعد انگریزوں سے آزاد کروانے والا محمد علی جناح ہی تھا جو کہ یقیناً ایک مولوی نہیں تھا اور یہ علمائے سُو تحریک پاکستان کے ازلی دشمن تھے جو جب بھی تھے اور اب بھی ہیں۔ان علمائے سُو کو استعمال تو کیا جاسکتا ہے مگر کوئی لیڈر اپنے پیچھے نہیں لگا سکتا۔اب بھارت اور پاکستان کے تعلقات بذریعہ پٹھان کوٹ حملہ یہی بے لگام لشکر ختم کرانے کے چکر میں ہیں،ادھر اب چائنا کو ریڈور کے خلاف بھی منافق طاقتیں اچانک اُٹھ کھڑی ہیں۔

پی پی پی کی باسی کڑی میں اُبال آیا ہے۔تنقید تعمیری کرنی تو ٹھیک ہے مگر بغض معاویہ رکھ کر نہ کی جائے۔مگر ہمارے لیڈر اتنے ذہین نہیں کہ وقت کو سنبھال لیں۔یہی بنگلہ دیش بنانے والے اذہان اب بھی سرگرم ہیں۔قائداعظم نے اس قوم کو تنظیم،ایمان،اتحاد کا درس دیا ہے،مگر مخالف پاکستان قوتوں نے اس ملک کو پارہ پارہ کرنے کی قسم کھا رکھی ہے۔خصوصاً علمائے سوء نے۔اقتدار مثبت سوچ رکھنے والے ہاتھوں میں نہیں،محب وطن طاقتوں کے ہاتھ میں نہیں،تنظیم،ایمان،اتحاد کو دولت کی چاندی نے اغوا کرلیا ہے،خودغرضی اور لادینیت نے اسے اندھا کر دیا ہے،ایوانِ عدل میں انصاف نہیں،ایوانِ امن میں خودداری و امن نہیں،اب ہر چیز کی قیمت ڈالر اور ریال سے لگائی جاتی ہے ضمیر اور عدل سے نہیں۔ہم اپنے اسلاف کو بھول چکے ہیں،ہم اپنی اوقات بھول چکے ہیں،اپنا مقام،اپنا ایمان و دین بھول چکے ہیں،جو انسان اپنی شان اور مقام کو بھول جاتا ہے یقیناً خدا تعالیٰ بھی اُن کو بھول جاتا ہے،اللہ نہ کرے۔آمین۔

❁❁

ارفع کریم

شیراز وحید خان

۱۴ر جنوری دنیا کی کم عمر ترین مائیکروسافٹ سرٹیفائیڈ پروفیشنل ''ارفع کریم'' کا یومِ وفات ہے۔ارفع کریم 2 فروری 1995 کو فیصل آباد میں پیدا ہوئی۔صرف 9 سال کی عمر میں دنیا کی کم عمر ترین مائیکروسافٹ سرٹیفائیڈ پروفیشنل ہونے کا اعزاز حاصل کیا۔مائیکروسافٹ ہیڈکوارٹر،امریکا میں بل گیٹس کے ساتھ یادگار تصویر ارفع کریم کے کارنامے کا منہ بولتا ثبوت ہے۔اپنی ذہانت کے باعث وہ ملک کے سب سے بڑے سول ایوارڈ، پرائیڈ آف پرفارمنس کی حقدار بھی بنیں۔ارفع کے باعث جو عزت اس ملک وقوم کو ملی، وہ ناقابل فراموش ہے۔ارفع کی زندگی صرف سائنس و ٹیکنالوجی تک ہی محدود نہ تھی، وہ الفاظ کو خوبصورت شعروں میں پرونا بھی خوب جانتی تھی۔پھر 22 دسمبر 2011ء کو ارفع کریم اچانک کارڈیک اریسٹ کا شکار ہوئی اور پھر اس ذہین دماغ پر خاموشی چھا گئی۔پوری قوم ارفع کی صحت یابی کے لئے دعا گو تھی، لیکن قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔

❁-❁

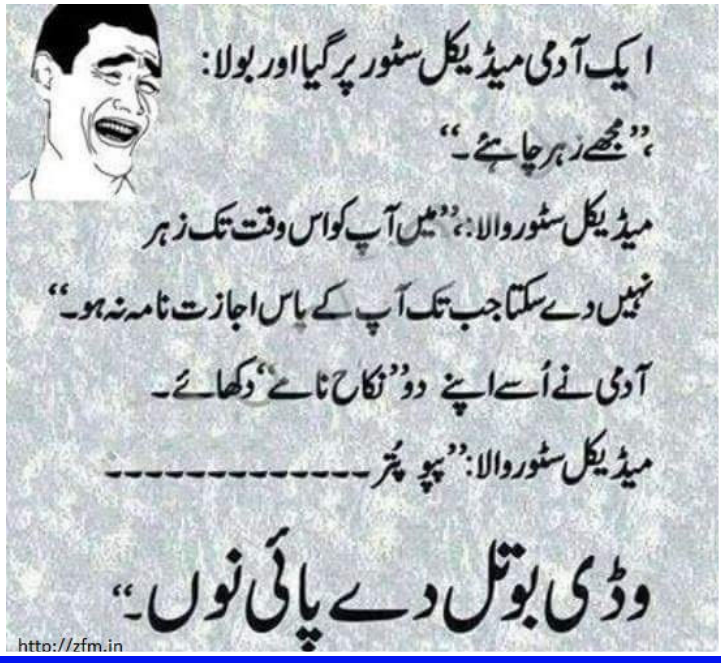

آخری پڑاؤ

افسانہ

جتندر بلّو

ڈھلتی عمر میں رام مورتی کے ساتھ نیند کا رشتہ ٹوٹ رہا تھا۔اُسے نیند بھی جار گھنٹوں کی ملا کرتی اور کبھی مشکل سے پانچ۔یہ اُس کے ساتھ روز کا قصہ تھا۔معاً اُس کی آنکھ کھل گئی تھی۔ہر سو اندھیرا تھا اور گہرا سناٹا۔شدید سردی کے کارن اندھیرا اپنے گاڑھے پن کا احساس دلا رہا تھا۔جانے وہ رات کا کون سا پہر تھا کہنا مشکل ہے۔گو کہ برقی لیمپ سرہانے دھرا تھا۔اُسے جلا کر میز پر رکھی گھڑی سے وقت دیکھا جا سکتا تھا۔مگر لیمپ جلانے کو اُس کا من ہی نہ مانا۔البتہ اُس کے باطن میں دُکھ جھیلتے ہوئے مریض نے اتنا ضرور کہا کہ کیا دن اور کیا رات؟ دونوں یکساں اُس کی نظر میں اپنی اہمیت کھو چکے ہیں۔وہ گھنٹوں بستر پر پڑا کوئی کتاب یا اخبار اُٹھا کر پڑھتا رہتا یا پھر خالی خالی نظروں سے چھت کو تکتا سوچا کرتا کہ عمر کے آخری پڑاؤ میں انسانی زندگی میں بیماریاں کیوں دبے پاؤں چلی آتی ہیں؟ اور وہ تادم آخر مریض کے ساتھ ہی کیوں رہا کرتی ہیں؟ مگر کوئی معقول جواب نہ پا کر اُس کی سوچ سوالیہ نشان بن کر رہ جاتی۔

وہ جن دنوں برسرروزگار تھا اور لندن ٹرانسپورٹ میں ملازم تھا۔فشارِ خون (B.P) نے اُسے آن گھیرا تھا۔پھر خوش خوراک اور قدرے مے نوش ہونے کے کارن ذیابیطس (Diabetes) نے اپنا رنگ دکھانا شروع کر دیا تھا۔ابھی چند برس بھی نہ بیتے تھے کہ نقرس (Gout) نے اُسے تنگ کرنا شروع کر دیا تھا۔پاؤں سوج کر سرخ ہو جاتے اور درد دھیرے دھیرے بڑھنے لگتا۔انجام کار گھنٹیاں (Osteo Artheritis) نے اُس کے بدن میں اتر کر اپنا گھر بنا لیا تھا۔انھوں نے مل کر اُس کے شریر سے ماس بھی چرانا شروع کر دیا تھا۔وہ اکیلے میں سوچا کرتا کہ اتنی ساری بیماریاں آدمی کو کیوں کر گھیر لیتی ہیں؟ اُن سے رہائی پانے کا کوئی وسیلہ تھی ضرور رہا ہوگا؟ پھر کہیں اُڑتا ہوا ایک خیال اُسے خود میں دبوچ لیتا کہ سوئیز لینڈ کے شہر زیورک میں یوتھا نیزیا (Euthansia) کا ایک ادارہ ڈگنی ٹس (Dignitas) کے نام سے انوٹی طور پر قائم ہے۔جہاں مریض کو رکن بن جانے پر ڈاکٹر کی تفصیلی میڈیکل رپورٹ اور کاغذی کارروائی مکمل ہونے پر اُسے ایک انجکشن دن رات کر بناک امراض سے نجات دلا دیتا ہے اور وہ شخص مسکراتا ہوا اپنے مالک حقیقی سے جا ملتا ہے۔پھر یہ خیال بھی اُسے تقویت دیا کرتا کہ وہ موت کتنی حسین ہوگی؟ محض ایک انجکشن اور معاملہ ختم اور مریض مکمل آزاد ...ورنہ وہ ایڑیاں رگڑ رگڑ کر اور دوسروں کو تکلیف پہنچا کر ہی دم توڑتا ہے۔

بارہا وہ اپنے گھر کے لاؤنج مین بیٹھا سوچا کرتا کہ اُس نے بچپن، جوانی اور ادھیڑ عمر میں کسی بھی شخص کو دھوکہ نہیں دیا' کوئی دکھ نہیں پہنچایا، کسی کی حق تلفی نہیں کی، کسی کا پیسہ نہیں مارا، بے ایمانی نہیں کی؟ پھر اتنی ساری بیماریوں نے اُسے کیوں کر گھیر رکھا

ہے؟ کیا یہ پچھلے جنم کے کرم ہیں یا سنسکار؟ ممکن ہے وہ اُن کا پالن ٹھیک طرح سے نہ کر پایا ہو جن کی سزا اُسے اس جنم میں مل رہی ہے۔ وہ جانتا تھا کہ اُس کی باڈی کیمسٹری بدل چکی ہے۔ قوت مدافعت بھی قریب قریب جواب دے چکی ہے۔ حالانکہ اُس کی عمر اتنی زیادہ نہیں ہے کہ وہ نیم مردہ بنا دن رات سانس لیتا پھرے۔ دو برس پہلے وہ ستر کا ہوا تھا۔ اُسے اکثر خیال آتا کہ اُس سے بڑی عمر کے بے شمار لوگ پارکوں میں ہائی اسٹریٹ میں اور شاپنگ مال میں گھومتے نظر آتے ہیں۔ اُن میں سے بعض تو چھڑی کا سہارا بھی نہیں لیتے۔ ہشاش بشاش چلتے پھرتے ہیں۔ گر اُسے قدم بڑھانے میں دو دو چھڑیوں کا سہارا لینا پڑتا ہے... اچانک کہیں سے وہ سرد سام اُڑ کر اُس کے سامنے آن کھڑی ہوئی تھی۔ جب اُسے اگلے روز اپنی عمر عزیز کے ساٹھویں برس کو چھونا تھا۔ وہ دفتر سے لوٹا تھا۔ تھکا ماندہ۔ دن بھر کمپیوٹر پر اپنا سر کھپا کر دماغ کا گودا خشک کر چکا تھا۔ مگر گھر مین پاؤں رکھتے ہی اُس کی ذہنی کیفیت بدل کر رہ گئی تھی۔ گھر میں موجود ہر شے سے اُسے اُنسیت تھی اور اپنا پن بھی تھا۔ کمرے میں داخل ہو کر اُس نے چرمی بیگ صوفے پر پھینکا۔ کوٹ بستر پر پھیلایا۔ اتنے میں اس کی بہو دیویانی کندھے پر انا دوسرا شیر خوار بچہ رکھے داخل ہوئی۔ پہلے تو اُس نے اپنے سسر کو آنے والی سالگرہ کی بدھائی دی پھر بولی: ''پاپا۔ کل آپ ساٹھے پاٹھے ہو جائیں گے۔''

وہ دیر تک ہنستے رہے پھر رام مورتی نے ببلو کو پیار سے دیکھا اور اپنے ماضی میں جھانک کر کہا: ''اکتیس برس ہو گئے ہیں اس دیس میں آئے ہوئے... تیسرا گھر والا میرے کندھے پر تھا، جب ہم انڈیا سے لندن ائے تھے... مگر اب سے تو اس گھر میں آئی ہے۔ تو نے اور سریش نے مل کر میری ہر سالگرہ دھوم دھام سے منائی ہے، اُس سمے میرا سر آکاش کو چھو جاتا ہے۔'' دیویانی خوش ہو گئی تھی۔ مگر اُس کو بسورتا بچہ اوں ہاں کرتا دودھ کا طلب گار تھا۔ اس نے رونا بھی شروع کر دیا تھا۔ دیویانی اسے اپنے سسر کے حوالے کر کے اُس کے واسطے دودھ اور سسر کے لئے چائے بنانے کچن میں چل دی تھی۔ گول مول ببلو کو دادا کے ہاتھ زیادہ پسند نہیں آئے تھے۔ اس نے اونچے سروں میں رونا شروع کر دیا تھا۔ دادا نے اُسے چپ کراتے ہوئے اپنے مکان پر ایک اُچٹتی سی نگاہ ڈالی۔ ایک پل ببلو کو دیکھا۔ پھر سوچا کہ اُسے سرکاری ملازمت سے سبکدوش ہونے میں ابھی پانچ سال کا وقفہ ہے۔ کیوں نا اس مکان کو فروخت کر کے نیا بڑا مکان خریدا جائے؟ جہاں اُس کے پوتے، پوتی کو کھیلنے کودنے اور باغیچے میں دوڑنے کی مکمل آزادی ہو۔ منع کرنیپر بھی وہ کوی کیاری روند ڈالیں کوئی پھول توڑ ڈالیں۔ مگر وہ بذات خود ذرا بھی نہ برا مانے بلکہ خوش ہو کر بلے بلے کرتا ببلو اور اس کی بہن دالی کو منہ چوم لے۔ ایسا سوچتے سوچتے اس نے ببلو کا منہ چوم لیا۔ مگر اُس کا رونا کسی بھی طور کم نہ ہوا۔

ادھر رام مورتی نے بڑے چاؤ سے نیا مکان خریدا۔ اُدھر ایک کے بعد دوسرا مرض موڑ پر کھڑا اُس کے انتظار میں تھا۔ چند ہی برسوں میں اُنھوں نے اُسے کہیں کا نہ چھوڑا تھا۔ جانتا تھا کہ انسان کے بدن کی مشین ایک بار بگڑ جائے تو وہ بگڑتی ہی چلی جاتی ہے۔ مگر وہ بھی سخت جان تھا۔ کھتری پتر تھا۔ ڈٹ کر مقابلہ کرنا اُس کا دھرم بھی تھا اور تو وہ بھی۔ مگر شیر تو بوڑھا ہو جا رہا تھا۔ ذیابیطس اُسے دیمک کی طرح چاٹ رہی تھی۔ عمارت ڈے رہی تھی۔ صبح شام کے انجکشن اپنا رنگ دکھا کر عمارت کو گرنے سے ضرور بچا رہے تھے۔ مگر آرتھرائیٹس کے حملوں نے رہی سہی کسر پوری کر ڈالی تھی۔ درد بے پناہ ہوا کرتا۔ مگر اُس کی مضبوط قوت ارادی نے اُسے سنبھال رکھا تھا۔ مگر کب تلک؟ وہ اندر سے ٹوٹ رہا تھا بکھر رہا تھا۔ گھر سے باہر قدم رکھنا اُس کے واسطے دسوار ہو رہا تھا۔ چار دیواری ہی اُس کی کل کائنات بنتی جا رہی تھی۔ یہ المیہ اُس کی آنکھوں کو غمناک کر دیا کرتا۔ ایک نصف شب کو اُس کے پاؤں کے بڑھتے ہوئے درد نے اُس کی نیند اُچاٹ کر رکھی تھی۔ نقرس کا حملہ تھا۔ سوجن کے ساتھ درد بھی اتنا زیادہ تھا کہ خود پہ جبر کرتے ہوئے بھی وہ ''اے ماں... اے بھگوان... اے رام جی'' کو یاد کرتا ہوا دیر تک اُس کا الاپ جاری رہا۔ کربناک آواز کا اتار چڑھاؤ بھی اپنی جگہ قائم تھا۔ کچھ دیر میں اچانک کمرے کا دروازہ کھلا۔ بتی جلی۔ بیٹے کی آواز سنائی دی:

''پاپا! درد بہت ہے؟ Pain Killer دے دوں؟'' ''نہیں سریش... گولی کچھ دیر اپنا اثر ضرور کرتی ہے... پھر درد شروع ہو جاتا ہے... گاؤٹ ڈائی بیٹز بلڈ پریشر اور آرتھرائیٹس نے میرے شریر میں اپنی جڑیں مضبوط کر لی ہیں... اب اُن سے نجات ممکن نہیں... صبح آرتھرائیٹس نے بھی تنگ کیا تھا... اب انگلیاں اکڑ جاتی ہیں اور ہاتھ مڑنے لگتے ہیں۔'' ''شام میں آپ نے بتایا کیوں نہیں؟'' ''کیا بتاتا... تم تھکے ٹوٹے دفتر سے آتے ہو... بتا کر تم کو پریشان ہی کرتا۔'' ''میں کل ہی ہارلے اسٹریٹ کے کسی چوٹی کے آسٹیوپیتی سے وقت لیتا ہوں۔'' ''نہیں بیٹے نہیں... تو تو پگلا ہے... تیرے دادا کو بھی یہی مرض تھا... وہ تو چلنے پھرنے سے بھی رہ گئے تھے۔ مجھے کو اُن سے کچھ تو ملنا ہی تھا... جینز (Genes) چھ سات نسلوں تک اپنا رنگ دکھایا کرتی ہیں... اب گلا کیا؟ یہ مرض تو اب بڑھتا ہی رہے گا... تو میرا ایک کام کر۔ مجھ کو زیورک لے چل... یہ میری آخری اچھا ہے... اب اور دکھ درد برداشت نہیں ہوتا۔''

سریش خاموش رہا۔ ''چپ مت رہ... کچھ تو بول... زیورک جاؤں گا تو سب کی پریشانیاں دور ہو جائیں گی۔'' ''پاپا! یہ اتنا آسان نہیں جتنا آپ سمجھ رہے ہیں... قانون مجھ کو اپنی پکڑ میں لے سکتا ہے... مجھے چودہ برس تک کی سزا بھی ہو سکتی ہے۔ یہاں کا قانون اجازت نہیں دیتا کہ کوئی شخص مریض کو بیرون ملک لے جائے اور خود کشی کرنے میں اُس کی مدد کرے۔'' ''ہاں ہاں... جان... تا ہوں... پھر کبھی بات کریں گے... جا... تو سو جا... صبح تجھ کو کام پر بھی جانا ہے۔'' مگر سریش بت بنا دیر تک وہیں کھڑا رہا۔ وہ باپ کو کراہتا دیکھ سخت پریشان تھا۔ اندر ہی اندر روئے بھی جا رہا تھا۔ اس نے زبردستی باپ کو نیند آور گولی کھلائی۔ پانی پلایا۔ بستر پر لٹا کر بتی گل کی۔

لیکن کمرہ چھوڑنے سے پہلے گولیوں کی شیشی جیب میں ڈال لی اور دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ پھر لینڈنگ سے ہوتا ہوا اپنے کمرے کو چل دیا۔ مگر باپ کا کراہنا اُس کے کانوں سے الگ نہ ہو پایا۔ اس کی آنکھیں باپ کی محبت اور احترام میں گیلی ہو گئیں تھیں۔ ویک اینڈ کا آغاز تھا۔ گھر کے سبھی افراد دیر سے بیدار ہوا کرتے تھے۔ مکان کی پہلی منزل پر تین کمرے تھے۔ دو کمرے بچوں کے پاس تھے۔ ڈالی چودہ برس کی ہو چکی تھی اور بلو بارہ کا۔ تیسرا بڑا کمرہ بہو بیٹے کے پاس تھا۔ نیچے لاؤنج کے ساتھ ڈرائنگ روم کے برابر ہاتھ/ ٹائیلٹ سے جڑا ہوا کمرہ رام مورتی کھنہ کا تھا۔ اپنا نام لے کر اور خود کو یاد کر کے اس کا چہرہ فخر سے کھل اٹھا تھا۔

اُس کی پیدائش بٹوارے سے پہلے انگریزوں کے زمانے کی تھی۔ اُن دنوں جیمنی سرکس میں ایک نہایت طاقت ور شخص رام مورتی کے نام سے ہوا کرتا تھا۔ وہ اپنے بدن کے گرد موٹے موٹے رسے باندھ کر بھاری ٹرک اور موٹریں کھینچا کرتا تھا۔ انگریزوں نے اسے انعام اور سند سے بھی نوازا تھا۔ ذہن کو جھٹک کر اس نے اپنے بارے میں سوچا کہ اس کی ماں بتاتی تھی کہ جب وہ پیدا ہوا تھا تو اس کا وزن دس پاؤنڈ آٹھ اونس تھا۔ اس گولو مول بچے کے بارے میں اُس کے والد ماجد کا خیال تھا کہ اُس کا بیٹا بڑا ہو کر یقیناً رام مورتی پہلوان کی طرح طاقت ور بنے گا۔ مگر اب اُسے اپنے بے جان اور ہڈیالے بدن پر نظر ڈال کر ہر بات جھوٹی لگا کرتی اور والد ماجد کا خیال بھی محض ایک بھیانک مذاق۔ کھانے کی میز پر پورا کنبہ بیٹھا ناشتہ کر رہا تھا۔ دنوں بعد صاف آسمان دکھنے میں آیا تھا۔ باہر لان پر میٹھی دھوپ بھی پھیلی ہوئی تھی۔ اس کے من نے چاہا کہ وہ دھوپ میں بیٹھ کر ناشتہ کرے۔ مگر موسم گلابی جاڑے کا تھا اور ہوا بھی قدرے سرد تھی۔ لہٰذا اس کی خواہش دل میں ہی رہ گی تھی۔ اس کا پوتا اور پوتی اس کے سامنے بیٹھے ناشتہ کر رہے تھے۔ وہ عموماً ویک اینڈ پر ہی اُن کو آنکھ بھر کر دیکھا کرتا تھا اور اُس کے چہرے پر رونق آ جایا کرتی تھی۔ وہ اپنی لیٹ کو کم عمر پوتے پوتی کو زیادہ دیکھ رہا تھا۔ ورنہ بچے اس کے مرے کے آگے سے چپکے سے گزر کر اپنے اپنے کمرے کی طرف بڑھ جایا کرتے تھے۔ ایک بار اُن کے باپ نے انھیں ڈانٹ بھی پلائی تھی وہ گھر مین اسکول سے آتے جاتے گرینڈ پا سے بات یوں نہیں کرتے؟ ان کا حال احوال کیوں نہیں پوچھتے؟ لیکن ڈالی نے اپنی صفائی میں جو جواب اپنے ڈیڈ کو دیا تھا اُس نے رام مورتی کی سوچ کے زاویے ہی بدل ڈالے تھے۔ اس سے وہ اپنے کمرے کی دہلیز پر کھڑا تھا۔ ''ڈیڈ...میں چھوٹی تھی تو گرینڈ پا کتنے ہینڈسم تھے، کتنے اسمارٹ تھے۔ میں کبھی نہیں بھولتی۔ مگر اب اُن کو دیکھ کر ڈر جاتی ہوں... بلو تو ان کا فرینکن اسٹائن بھی کہتا ہے۔'' ''شٹ اپ ...یو اسٹوپڈ ...وہ تمہارے گرینڈ پا ہیں اُن کا نام عزت سے لیا کرو۔''

ڈالی کا چہرہ اتر گیا تھا۔ لیکن رام مورتی نے اس کی بات کا برا نہیں مانا تھا۔ بچے تو حساس ہوا ہی کرتے ہیں۔ بھیانک روپ کو دیکھ ڈر جاتے ہین۔ اپنوں سے بھی دور دور رہتے ہیں۔ اسے خیال آیا کہ جب تک بیماریوں نے اسے گھیرا نہیں تھا، ڈالی اور بلو اکثر اس کے کمرے میں اودھم مچایا کرتے تھے۔ اسکول کا ہوم ورک بھی وہاں بیٹھ کر کیا کرتے تھے۔ پارک میں اس کے ساتھ گھومنے بھی جایا کرتے تھے۔ وہاں آئس کریم بھی کھایا کرتے تھے۔ مگر اب وہ دھیرے دھیرے بے گانے ہو جا رہے تھے۔ بیماریوں نے اس کا فطری حسن اور چہرے کی تازگی کیا چھینی، گہری لکیروں نے اس کے چہرے پر مستقبل ڈیرا ڈال لیا تھا۔ آنکھوں کے نیچے سیاہ حلقے بھی پھیل گئے تھے۔ رخساروں کی ہڈیاں ابھرتے ہی گال اندر کو دھنس گئے تھے۔ ہونٹوں کے دونوں طرف اور ٹھوڑی کے نیچے ابھرے ہوئے ماس سے اس کی شکل اتنی بگڑ گئی تھی کہ کوئی بھی اسے دیکھ کر محسوس کرتا تھا کہ ایک بوڑھا بد صورت شخص اس کے سامنے کھڑا ہے اور وہ چراغ سحر بجھا جاتا ہے۔ آئینے میں وہ اپنا بدلا ہوا چہرہ دیکھ کر خود بھی بعض دفعہ ڈر جایا کرتا تھا۔ بارہا اُسے خیال آتا کہ کیا وہ وہی شخص ہے جسے یونیورسٹی کے دنوں میں اور شادی کے بعد بھی جوان لڑکیاں پلٹ پلٹ کر دیکھا کرتی تھیں۔ مگر وہ خود مست اور جوانی کے نشے میں سرشار انھیں نظر انداز کر دیا کرتا تھا۔ کہین اُن کی بد دعا تو اسے لگ کر نہیں رہ گئی؟

''پاپا! اپ کچھ کھا نہیں رہے؟'' بیٹے کی آواز نے اس کی سوچ کا تسلسل توڑ ڈالا تھا۔ وہ ماضی سے نکل کر حال میں آ گیا تھا۔ اس نے افسوس سے کہا۔ ''کیا کھاؤں بیٹے ...کھانے پینے کے مزے تو اب جاتے رہے... تیری ماں جیوت تھی تو اس کے ہاتھوں کا پکا ہوا ہر پکوان میں چٹ کر جایا کرتا تھا... ویسے بہو بھی پکوان مزے کے بناتی ہے ...پر اب کھانے کو من ساتھ نہیں دیتا... گولیاں کھا کھا کر سب اندر سے مرتا جا رہا ہے۔ بھوک کم لگتی ہے۔'' بیٹا سنجیدہ تھا۔ باپ کی گرتی ہوئی صحت دیکھ کر وہ مدت سے فکر مند تھا۔ لیکن باپ کی محبت میں وہ کوئی بھی ایسا قدم اٹھانا نہیں چاہتا تھا کہ اس کی اپنی فیملی کو کوئی نقصان پہنچے۔ اُسے اپنے بیوی بچے بہت عزیز تھے۔ دیویانی نے اصرار کیا: ''پاپا ۔آپ کچھ کھائیں گے نہیں تو اور کمزور پڑ جائیں گے۔''

رام مورتی نے بادل نخواستہ ڈبل روٹی کا ایک سلائس اٹھا کر آملیٹ کا ٹکڑا اس پر رکھا اور آہستہ آہستہ اُسے چبانے لگا۔ مگر وہ چبانے کے عمل کے دوران بھی بیٹے کو برابر دیکھے جا رہا تھا۔ آخر بولا۔ ''سرجو بیٹے۔'' سریش اپنے بچپن کا گھریلو نام سن کر چونک اٹھا تھا۔ سالوں بعد اس کے باپ نے اسے اس نام سے پکارا تھا۔ اس نے نہایت چاؤ سے اپنے باپ کو دیکھا۔ محبت احترام سے اُس کا چہرہ بھر گیا تھا۔ اس نے خود کو اپنے بچپن میں دوڑتا ہوا پایا۔ جب اُس کے ماتا پتا اسے سرجو سرجو پکارتے تھکا نہیں کرتے تھے۔ وہ ان کی اکلوتی اولاد تھا اور آنکھوں کا تارا بھی۔ ''جب کبھی میں نے تجھ کو زیورک لے جانے کو کہا، تو خاموش رہا یا ٹال کر ادھر ادھر کی بات شروع کر دی... جانتا ہوں تو

باپ کو مرتا نہیں دیکھ سکتا اور نہ ہی اس کی موت چاہتا ہے۔'' پھر وہ گہری سوچ میں ڈوبا بیٹے کو ٹکٹکی باندھے دیکھتا رہا۔ جب اپنے مکمل یقین ہو گیا کہ اس کا بیٹا اس کی موت کے سلسلے میں اس کی کوئی مدد نہیں کرے گا۔ تو اس کی آنکھیں خود بخود بند ہو گئیں اور گردن سینے کی طرف ڈھلک گئی۔ میاں بیوی گھبرا گئے۔ سریش نے چھوٹتے ہی کہا: ''پاپا! پاپا آپ ٹھیک تو ہیں نا؟'' رام مورتی نے آنکھیں کھول ڈالیں اور بیٹے کو سنجیدگی سے دیکھ کر کہا: ''میں جانتا ہوں یہ کام تیرے واسطے بہت مشکل ہے... مجھ کو ہی کچھ کرنا ہو گا۔'' ''لیکن پاپا'' دیویانی نے فوراً مداخلت کی: ''جیون تو بھگوان دیتا ہے۔ وہی واپس بھی لیتا ہے... ہم اپنی مرضی سے اپنا جیون ختم کرنے والے کون ہوتے ہیں؟'' ''تم ٹھیک کہتی ہو بہو... میں ان باتوں کو خون سمجھتا ہوں... پر کیا کروں۔ جس تن لاگے وہ تن جانے۔ کون جانے پیڑ (درد) پرائی۔'' بچے اُن کی گفتگو سے خوش نہ تھے۔ حد درجہ بور ہو چکے تھے۔ اٹھ کر لاؤنج کی طرف بڑھ گئے۔ وہاں ٹیلی ویژن جاری تھا۔ دیویانی نے بات آگے بڑھائی۔ ''ہم آپ کے دکھ درد کو خوب سمجھتے ہیں... مگر ہم مجبور ہیں۔ آپ کا دکھ درد بانٹ نہیں سکتے۔'' ''مگر چھٹکارا تو دلا سکتے ہو؟'' میاں بیوی نے چونک کر ایک دوسرے کو دیکھا۔ پھر ان کی گردن اپنی اپنی پلیٹ پر جھک گئی۔ مگر سریش اپنی پلیٹ کو آگے کھسکا کر کھڑا ہو گیا اور سنجیدگی سے ''ایکسکیوزمی'' کہہ کر لاؤنج کی طرف بڑھ گیا۔ دیویانی اپنے شوہر کو جاتا دیکھ کر از حد پریشان تھی۔ مگر اس نے اپنا نقطہ نظر برقرار رکھا: ''آپ پریوار میں سب سے بڑے ہیں۔ اگر آپ چلے گئے تو گھر کی ساری ذمہ داریاں سارا بوجھ آپ کے بیٹے پر آ جائے گا۔'' یہ کہہ کر اس نے میرے پلیٹیں اتنی تیزی سے سمیٹنا شروع کر دیں کہ رام مورتی حیران رہ گیا۔ دیویانی بولی: ''اب تو میں بھی جاب (Job) نہیں کرتی۔ نہیں تو سریش کا ہاتھ بٹاتی اور ہم کو کوئی تکلیف نہ رہتی۔''

وہ ناراض تھی۔ چہرہ بھی غصے سے بھر گیا تھا۔ لیکن رام مورتی سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ دیویانی کو اس کے مرنے پر کیا اعتراض ہو سکتا ہے؟ زندگی تو اس کی ہے دیویانی کی نہیں؟ وہ خود اپنی مرضی سے مرنا چاہتا ہے۔ گھر کر ہر فرد اس کے بڑھاپے اور بیماریوں سے پریشان ہے۔ اس کے چلے جانے میں ہی سب کی بہتری پوشیدہ ہے۔ وہ اس تناظر میں سوچ ہی رہا تھا کہ بہو کا موقف و راس کے ادا کردہ جملے اس کے کانوں میں گونج کر خود کو دہرانے لگے۔ ان میں پوشیدہ کئی معنی اس کی سمجھ میں آنے لگے۔ مکان کی ماہانہ قسط (مورگیج) وہ ادا کر رہا تھا۔ لندن ٹرانسپورٹ کی پنشن اور سرکاری پنشن ہر ماہ پابندی سے اس کے بینک میں جمع ہو رہی تھیں۔ گھر کے کئی چھوٹے موٹے بل بھی وہ چکا دیا کرتا تھا۔ ڈالی کی پبلک اسکول کی فیس بھی وہ ادا کر رہا تھا۔ ظاہر ہے کہ اس کے چلے جانے سے گھر کے اخراجات کا تو از واقعی بگڑ کر رہ جائے گا۔ سریش مالی پریشانیوں کا شکار ہو جائے گا۔ یہی سوچتے سوچتے اسے اپنا بھی خیال آیا کہ اس کا مسلسل دکھ جان لیوا کرب بے خواب راتیں ان سب کا کیا ہو گا؟ وہ کس کھاتے میں درج ہوں گے؟ جب اسے کوئی جواب نہ ملا تو اس نے ایک لمبا سانس بھر کر باہر چھوڑا اور اس نتیجے پر پہنچا کہ نہ تو وہ اپنی مرضی سے مر سکتا ہے اور ہی جی سکتا ہے۔ آخر وہ کیا کرے؟ کس سے فریاد کرے؟ کہاں جائے؟ رام مورتی کا ڈاکٹر (جی پی) ذات کا اسکاٹ تھا۔ تجربہ کار، روشن دماغ اور ہنر میں یکتا۔ علاقے میں اس کی ساکھ ایک ہمدرد انسان دوست کی تھی۔ وہ رام مورتی کی پوری داستان سن کر اور اس کی Assited Suicide کی خواہش جان کر اپنی انگشت شہادت دانتوں میں داب بیٹھا۔ اور اسے ششدر دیکھنے لگا۔ گویا وہ کسی دوسرے سیارے کی مخلوق ہو۔ سنبھلا تو بولا: ''کمال ہے تم پہلے مریض ہو جو اپنی موت خود مرنا چاہتا ہے۔ ورنہ میرے پاس وہ مریض بھی آتے ہیں جو مرنے کے قریب ریب ہوتے ہیں مگر وہ دیر عمر تک زندہ رہنا چاہتے ہیں ...واقعی وہ زندگی سے محبت کرتے ہیں۔'' ''لیکن ڈاکٹر... مجھ میں زندہ رہنے کی تڑپ ختم ہو چکی ہے...

میں دن رات دکھ درد کو سہتے سہتے تھک چکا ہوں... زندگی میرے واسطے اب مسلسل عذاب سے کم نہیں... جتنی جلدی چلا جاؤں، اتنا اچھا ہے... اب میں صحت یاب ہونے سے تو رہا۔'' ڈاکٹر اُسے گہری نظروں سے دیکھتا گہری سوچ میں گم تھا۔ آزاد ہوا تو بولا: ''مسٹر کھنہ... میں پیشہ ور ڈاکٹر ہوں ... میرا کام مریضوں کا علاج کرنا ہے... ان کے ہر مرض کو دور کرنا ہے... ان کو موت کے منہ میں دھکیلنا نہیں؟'' ''مانتا ہوں اور اس بات کو سمجھتا بھی ہوں ...لیکن ڈاکٹر تم ذرا یوں سوچو... ایک شخص جس کا بدن دن رات درد سے دکھتا رہتا ہو... اس کے پیروں کی سوجن ہر دوسرے تیسرے روز بڑھ جاتی ہو... اس کے ہاتھ اکثر مڑ جاتے ہو۔ اس کا بی پی (B.P) چھلانگیں لگا کر اس کے ذہنی تناؤ اور سر درد میں اضافہ کرتا ہو... اس کا شوگر لیول بھی بڑھ جاتا ہو اور کبھی کم ہونے پر وہ شخص سیمی کوما (Semi Coma) میں چلا جاتا ہو... پھر اس کی نیند بھی بمشکل چار پانچ گھنٹوں تک کی رہ گئی ہو۔ اس کے زندہ رہنے کا کیا جواز ہو سکتا ہے؟ اس سے بہتر ہے کہ وہ اپنے تمام دکھوں سے رہا ہو کر اپنے حقیقی لارڈ سے جا ملے اور کسی کو کوئی ملال نہ ہو۔'' ڈاکٹر مسکرا دیا۔ اس کی مسکراہٹ میں اس کا نفسیاتی مشاہدہ بھی شامل تھا۔ جانتا تھا کہ رام مورتی کسی دوسرے شخص کی آڑ میں اپنی بیماریوں کے ساتھ اپنی سمانی اور ذہنی کیفیات بھی بیان کر رہا ہے۔

سنجیدگی سے بولا: ''تم واقعی دکھی لگتے ہو... اولڈ ایج میں ہر کسی کو چھوٹی بڑی پرابلمز ضرور آیا کرتی ہیں۔ یہ قدرت کا اصول ہے۔ مگر کوئی بھی آدمی موت نہیں چاہتا... مگر تم تو خود ہی مرنے کی ٹھان بیٹھے ہو۔'' ''ہاں ڈاکٹر... میں اپنی مرضی سے مرنا چاہتا ہوں ... یہ زندگی اب میرے لئے کوئی معنی نہیں رکھتی ... میرے منے میں ہی میری مکتی ہے۔ اور عذاب سے نجات بھی۔'' ''مجھے تم سے پوری پوری ہمدردی ہے...

دن رات کا دکھ درد آدمی کو پریشان رکھتا ہے...لیکن میں تمہاری خودکشی کے سلسلے میں تمہاری کوئی مدد نہیں کرسکتا۔ البتہ تمہارا علاج جاری رہے گا...اور ہاں...'' پھر اس کا لہجہ بدل کر آہستہ آہستہ بولنا شروع کیا: ''میری کوشش رہے گی کہ جب میں تمہاری میڈیکل رپورٹ تیار کروں تو وہ اس قابل ہو کہ اُسے پڑھنے والا تمہاری ہر بیماری کا گہرا اثر لے۔ ہیتھرو ایئرپورٹ کے ٹرمینل نمبر دو سے زیورک جانے والے جہاز کی اڑان چالیس منٹ بعد تھی۔ رام مورتی وہیل چیئر پر بیٹھا گود میں سفری بیگ کے ساتھ ایک فائل رکھے اپنی دو چھڑیاں بھی سنبھالے ہوئے تھا۔ قریب ہی سریش اپنا اترا ہوا چہرہ لیے کھڑا تھا۔ دونوں خاموش تھے۔ لیکن جانتے تھے کہ وہ پل ان سے کچھ فاصلے پر کھڑا سدا ان کو ایک دوسرے سے الگ کردے گا۔ یقیناً وہ پل دونوں کی قسمت میں پہلے سے لکھ دیا گیا تھا اور آج وہ خود کو سچ ثابت کرنے والا تھا۔ رام مورتی دکھوں سے مکت ہوگا اور سریش باپ کے سائے سے محروم۔

آخر وہ پل آ ہی گیا جب اعلان ہوا کہ زیورک جانے والے مسافر گیٹ نمبر سات سے جہاز کی طرف بڑھیں۔ رام مورتی کے بدن میں زلزلہ سے آ گیا۔ بدن کا سارا لہو دل میں آتے ہی اس نے نظریں سریش کی طرف اٹھ گئیں۔ پھر وہ کرسی کا ہتھا پکڑ کر بمشکل اٹھا اور بے تحاشہ اپنے بیٹے سے لپٹ گیا۔ سریش کی گرفت بھی اتنی مضبوط تھی کہ رام مورتی کا دم گھٹنے لگا۔ وہ اپنا سانس چھوڑتے پکڑتے بولا۔ ''بیٹے ذرا آہستہ۔''

وہیل چیئر چلانے والا سیاہ فام شخص اس وجہ سے حیران تھا کہ باپ بیٹا گہری محبت میں گرفتار ایک دوسرے سے مدغم ہوا جارہے تھے۔ ''سر جو میرے بیٹے...میں اپنا کل اثاثہ تمہارے نام چھوڑے جارہا ہوں...بیٹی ڈالی پبلک اسکول میں ہی تعلیم پائے گی۔ ایک بات اور...کل صبح گیارہ بج کر دو منٹ پر میں اس جہاں میں نہیں رہوں گا۔ تم دوپہر میں پہلا جہاز پکڑ کر زیورک چلے آنا۔'' سریش حیران رہ گیا کہ ان باتوں کا ذکر گھر سے ایئرپورٹ چلتے وقت اس کے باپ نے بالکل نہ کیا تھا۔ وہ کار میں بالکل خاموش بیٹھے ایئرپورٹ تک خاموش ہی رہے تھے۔

''میری ڈیڈ باڈی Dead Body لندن لاکر میرا اتم سنسکار اپنی برادری میں شان دار طریقے سے کرنا اور سب کو کھانا بھی کسی مندر میں کھلا دینا...ڈالی اور ببلو سے کہنا کہ گرینڈ پا ان سے بہت پیار کرتا تھا۔ وہ فیونرل میں ایک دو منٹ میرے بارے میں ضرور بولیں۔ میری آتما کو شانتی ملے گی۔'' وہ خود کو سنبھالتا واپس وہیل چیئر پر بیٹھا ہی تھا کہ اس میں فوراً حرکت پیدا ہوئی۔ کرسی لمحہ بہ لمحہ آگے بڑھتی رہی۔ لیکن رام مورتی پلٹ پلٹ کر فضا میں دایاں ہاتھ لہراتا مسکرا کر سریش کو دیکھتا رہا۔ اس کا عمل تب تک جاری رہا جب تک کہ وہ مسافروں کی بھیڑ میں کھو نہیں گیا۔ سریش دیر تک بت بنا رہا۔ اس کی دنیا زیروزبر ہوگئی تھی۔

جستہ جستہ - عاصی صحرائی

ممکن ہے۔ جو قوم گدھے کا گوشت کھا سکتی ہے وہ گدھے کو بطور پارلیمنٹ ممبر منتخب بھی کرسکتی ہے۔

ایک سوال؟

اشفاق احمد لکھتے ہیں ایک سوال نے مجھے بہت پریشان کیا سوال تھا مومن اور مسلم میں کیا فرق ہے، بہت لوگوں سے پوچھا مگر کسی کے جواب سے تسلی نہ ہوئی ایک دفعہ گاؤں سے گزر رہا تھا دیکھا کے ایک بابا گنے کاٹ رہا ہے، نہ جانے کیوں دل میں خیال آیا کہ ان سے یہ سوال پوچھوں میں نے بابا جی کو سلام کیا اور اجازت لے کر سوال پوچھ لیا بابا جی نے تھوڑی دیر میری طرف دیکھتے رہے اور جواب دیا۔ مسلمان وہ ہوتا ہے جو اللہ کو مانتا ہے، مومن وہ ہوتا ہے جو اللہ کی مانتا ہے۔

سبق

ایک بار ۵۰ لوگوں نے ایک سیمینار میں شرکت کی۔ اچانک مقرر خاموش ہوگیا۔ ایک گروپ کو ایکٹوٹی کرنے کو کہا اور ہر ایک کو ایک ایک غبارہ دیا گیا اور ایک مارکر۔ سب کو کہا گیا کہ اس غبارے میں ہوا بھر کر اس پر سب لوگ اپنا اپنا نام لکھ دیں اور پھر اسے ایک کمرے میں چھوڑ دیں۔ اس کے بعد سب کو پانچ منٹ کے بعد اپنا اپنا غبارہ ڈھونڈنا ہے۔ سب لوگ بدحواسی میں اپنا اپنا غبارہ ڈھونڈنے لگے۔ کچھ لوگوں کے غبارے دوسروں کے پاؤں تلے آکر پھٹ گئے۔ مگر کوئی بھی اپنا مطلوبہ غبارہ حاصل نہ کرپایا، پھر دوبارہ یہ عمل دہرایا گیا، اور کہا گیا کہ جو بھی غبارے کو لے وہ اس پر لکھے نام والے شخص کو دے دے۔ فقط چند منٹوں میں سب لوگوں کے پاس اپنا اپنا غبارہ موجود تھا۔ مقرر نے سب کو مخاطب ہوکر کہا کہ بالکل اسی طرح ہماری زندگی ہے ہم بدحواسی میں اپنی خوشیاں تلاش کرتے ہیں، اس طرح ہمیں پتہ بھی نہیں چلتا کہ ہم دوسروں کی خوشیاں اپنے پاؤں تلے کچل رہے ہوتے ہیں۔ ہم یہ نہیں سمجھتے کہ ہماری خوشیاں دوسروں کی خوشیوں سے وابستہ ہیں دوسروں کو اُن کی خوشیاں دے دیں تو ہمیں بآسانی ہماری خوشیاں مل سکتی ہیں اور یہ ہی ہماری زندگی کا مقصد ہونا چاہیئے۔

جب بچپن تھا تو جوانی ایک خواب تھا
جب جوان ہوئے تو بچپن ایک زمانہ تھا
جب دیس میں تھے تو پردیس اچھا لگتا تھا
اب پردیس میں آکر گھر جانا اچھا لگتا ہے
اب گھر جا کر ماں کے ہاتھوں کا بنا ہوا کھانا اچھا لگتا ہے
کبھی سکول میں جن کے ساتھ لڑتے تھے۔

آج ان کو ہی فیس بک پر تلاش کر رہے ہیں۔خوشی اس میں ہے یہ آج پتا چلا بچپن کیا ہے۔اس کا احساس آج ہوا۔کاش بدل سکتے زندگی کہ وہ سال کاش جی سکتے زندگی پھر سے ایک بار

عالمی پیغام

حضرت امام جعفر صادق سے روایت ہے کہ ایک منادی آسمان سے آواز دے گا جسے ایک نوجوان لڑکی پردے میں رہتے ہوئے بھی سنے گی اہل مشرق و مغرب بھی سنیں گے۔ (بحارالانوار جلد 52 ملا محمد باقر مجلسی)

میں ہوں پاکستان مجھ پہ رحم کرو۔ذرا سوچو

چائنہ کی آبادی ایک ارب 35 کروڑ 14 وزیر،
انڈیا کی آبادی ایک ارب 27 کروڑ 32 وزیر،
امریکہ کی آبادی 32 کروڑ 14 وزیر،
برطانیہ کی آبادی 7 کروڑ 12 وزیر،
پاکستان کی آبادی 19 کروڑ 96 وزیر،

مشیر اس کے علاوہ ہیں:

ایک وزیر کے سال کا خرچ 16 کروڑ۔سب وزیروں کا سالانہ خرچ 96×16 یعنی 15 ارب 36 کروڑ ہر وزیر کو ماہوار 5000 ہزار یونٹ بجلی مفت، ماہانہ 45 وی آئی پی ہوائی ٹکٹ مفت، ماہانہ ایک لاکھ کا موبائیل بیلنس مفت جبکہ غریب عوام کیلئے نہ بجلی، نہ پانی نہ گیس۔میں ہوں پاکستان مجھ پہ رحم کرو!! آپ کا اپنا پیارا پاکستان

تعریف

ایک آدمی نے شادی کے 20 سال کی زندگی میں کبھی کھانے کی تعریف نہیں کی تھی۔ایک دن جمعہ کے خطبے میں مولوی صاحب نے کہا کہ تعریف کیا کرو، وہ شخص گھر گیا تو دال کھاتے ہوئے ہر لقمہ پر سبحان اللہ کہہ رہا تھا۔بیوی کچن سے روٹی پکانے والا بیلن لائی اور اس کے سر پر دے مارا اور کہا، 20 سال میں تو میری کبھی تعریف نہیں کی، آج پڑوسن نے دال کیا بھیجی تو اتنی تعریفیں ہو رہی ہیں۔

حفاظت

اپنے خیالوں کی حفاظت کرو کیونکہ یہ تمہارے الفاظ بن جاتے ہیں
اپنے الفاظ کی حفاظت کرو کیونکہ یہ تمہارے اعمال بن جاتے ہیں۔
اپنے اعمال کی حفاظت کرو کیونکہ یہ تمہارے کردار بن جاتے ہیں۔
اپنے کردار کی حفاظت کرو کیونکہ یہ تمہاری پہچان بن جاتے ہیں۔

خامیاں اور خوبیاں

ایک بڑھیا کے گھر میں پانی بھرنے کے لئے دو مٹکے تھے۔جنہیں وہ روزانہ ایک لکڑی کے دونوں طرف باندھ کر اپنے کندھے پر رکھتی اور نہر سے پانی بھر کر گھر لاتی۔ان دو مٹکوں میں سے ایک تو بالکل ٹھیک تھا دوسرا ذرا ٹوٹا ہوا تھا۔ہر بار ایسا ہوتا کہ جب یہ بڑھیا پانی لے کر گھر پہنچتی تو ٹوٹے ہوئے مٹکے کا پانی آدھا راستے میں ہی بہہ چکا ہوتا جبکہ دوسرا مٹکا بھرا ہوا گھر پہنچتا۔ثابت مٹکا اپنی کارکردگی سے بالکل مطمئن تھا، اور ٹوٹا ہوا بالکل ہی مایوس، حتیٰ کہ وہ اپنی ذات سے بھی نفرت کرنے لگا تھا کہ آخر وہ کیوں اپنے فرائض کو پورا نہیں کر پاتا، جس کی اس سے توقع کی جاتی ہے۔اور پھر مسلسل دو سالوں تک ناکامی کی تلخی اور کڑواہٹ لئے ٹوٹے ہوئے گھڑے نے ایک دن اس بوڑھی عورت سے کہا، میں اپنی اس معذوری کی وجہ سے شرمندہ ہوں، کہ جو پانی تم اتنی محنت سے کافی دور سے تم لاتی ہو اس میں سے کافی سارا پانی صرف میرے ٹوٹے ہونے کی وجہ سے گھر پہنچتے پہنچتے راستے میں ہی گر جاتا ہے۔گھڑے کی یہ بات سن کر بڑھیا ہنس دی، اور کہا تم نے ان سالوں میں یہ نہیں دیکھا کہ میں جس طرف سے تم کو اُٹھا کر لاتی ہوں اُدھر تو پھولوں کے پودے اُگے ہوئے ہیں جبکہ دوسری طرف کچھ بھی نہیں اُگا ہوا۔مجھے اُس پانی کا پورا پتہ ہے جو تمہارے ٹوٹا ہونے کی وجہ سے گرتا ہے، اسی تو میں نے نہر تک سے لے کر اپنے گھر تک پھولوں کے بیج بوئے تھے تاکہ وہ میرے گھر آتے آتے روزانہ پانی سے سیراب ہو جایا کریں۔ان دو سالوں میں کئی بار ان پھولوں سے میں نے پھول توڑ کر گلدستے بنا کر اپنے گھر کو سجایا اور مہکایا ہے، اگر تم میرے پاس نہ ہوتے تو پھر میں اس بہار کو کیسے دیکھ سکتی جو تمہارے دم سے مجھے نظر آتی ہے۔

یاد رکھیئے!!

کہ ہم میں سے ہر ایک شخص میں کوئی نہ کوئی خامی ہے، لیکن ہماری یہی خامیاں معذوریاں اور ایسا ٹوٹا ہوا ہونا ایک دوسرے کے لئے عجیب اور پر تاثیر قسم کے تعلقات بناتا ہے، ہم پر واجب ہے کہ ہم ایک دوسرے کو ان کی خامیوں کے ساتھ ہی قبول کریں۔ہمیں ایک دوسرے کی اُن خوبیوں کو اُجاگر کرنا ہے جو اپنی خامیوں اور معذوریوں کی خجالت کے بوجھ میں دب کر نہیں دکھا پاتے، معذور بھی معاشرے کا حصہ ہوتے ہیں، اور معذوریوں کے ساتھ ہی اس معاشرے کے لئے مفید کردار ادا کر سکتے ہیں۔جی ہاں ہم سب میں کوئی نہ کوئی عیب ہے پھر کیوں نہ ہم اپنے ان عیبوں کے ساتھ ایک دوسرے کی خامیوں اور خوبیوں کو ملا کر اپنی اپنی زندگیوں سے بھرپور لطف اُٹھائیں۔ہمیں ایک دوسرے کو اس طرح قبول کرنا ہے کہ ہماری خوبیاں ہماری خامیوں پر پردہ ڈال رہی ہوں۔

ماں سے بڑھ کر کوئی نام کیا ہوگا؟

اُس نام کا ہم سے احترام کیا ہوگا؟
جس کے پیروں کے نیچے جنت ہے، اُس کے سر کا مقام کیا ہوگا۔؟؟

قائداعظم اور آج کے قائدین

(رجل خوشاب)

☆۔کابینہ کا اجلاس تھا اے ڈی سی نے قائداعظم سے پوچھا کہ سر! اجلاس میں چائے دی جائے یا کافی۔قائداعظم نے چونک کر سر اُٹھایا اور کہا کہ یہ لوگ گھر سے چائے یا کافی پی کر نہیں آئیں گے۔یہ قوم کا پیسہ ہے۔وزیروں کے لئے نہیں جس نے چائے یا کافی پینی ہے وہ گھر سے پی کر آئے۔اس حکم کے بعد کابینہ میں اُن کی زندگی تک صرف سادہ پانی ہی دیا جاتا رہا۔

☆۔کچھ چیزیں گورنر جنرل کے دفتر کے لئے منگوائی گئیں۔جن کا بل ساڑھے اڑتیس روپے آیا۔قائداعظم نے بل منگوالیا۔ان میں کچھ اشیاء محترمہ فاطمہ جناح نے ذاتی استعمال کے لئے منگوائی تھیں کہا کہ ان اشیاء کا بل فاطمہ جناح کے اکاؤنٹ سے لے لیا جائے اور کچھ چیزیں قائداعظم کی ذات کے لئے منگوائی گئی تھیں۔ان کے متعلق کہا کہ یہ رقم میرے اکاؤنٹ سے لی جائے۔باقی اشیاء دفتر کی تھیں اُن کے متعلق کہا کہ آئندہ فضول خرچی سے اجتناب کیا جائے۔

☆۔برطانوی بادشاہ کا بھائی پاکستان کے دورے پر آرہا تھا۔برطانوی سفیر نے گزارش کی کہ آپ ائرپورٹ پر اُس کا استقبال کریں۔فرمایا میں تیار ہوں مگر جب کل کلاں میرا بھائی لندن جائے گا تو وزیراعظم کو بھی استقبال کرنا ہوگا۔

☆۔ایک روز اے ڈی سی نے ایک وزٹنگ کارڈ آپ کے سامنے رکھا قائداعظم نے کارڈ پھاڑنے کے بعد فرمایا کہ اسے کہنا کہ آئندہ مجھے اپنی شکل نہ دکھائے۔یہ اُن کا بھائی تھا۔اس کا قصور یہ تھا کہ اس نے اپنے کارڈ پر صرف یہ لکھا تھا کہ برادر آف گورنر جنرل آف پاکستان۔

☆۔زیارت میں سردی پڑ رہی تھی۔کرنل الٰہی بخش نے نئے موزے پیش کر دیئے۔دیکھے تو بہت پسند فرمائے۔پوچھے کتنے کے ہیں۔بتایا کہ دو روپے کے۔قائداعظم نے کہا کہ کرنل یہ تو مہنگے ہیں۔بتایا کہ جناب یہ آپ کے اکاؤنٹ سے خریدے گئے ہیں۔قائداعظم نے کہا کہ میرا اکاؤنٹ بھی تو قوم کی امانت ہے۔ایک غریب ملک کے سربراہ کو اس قدر عیاش نہیں ہونا چاہیئے۔اور وہ موزے واپس کر دیئے۔

☆۔زیارت ہی میں ایک نرس سے ایک بار پوچھا کہ بتایئے کہ میں آپ کے لئے کیا کر سکتا ہوں۔نرس نے بتایا کہ میرا سارا خاندان پنجاب میں رہتا ہے اور میں اکیلی ہی کوئٹہ میں ملازمت کرتی ہوں۔اگر ہو سکے تو میرا تبادلہ پنجاب کے کسی بڑے شہر میں کروادیں۔اُداس لہجے میں فرمایا کہ بیٹی یہ کام تو وزارت صحت کا ہے گورنر جنرل کا نہیں۔میں اس بارہ میں آپ کی کوئی مدد نہیں کر سکتا۔

☆۔قائداعظم نے اپنے طیارے میں رائٹنگ ٹیبل لگوانے کا لکھا تو وزارت خزانہ نے اجازت تو دے دی مگر فائل پر لکھا کہ اس قسم کا حکم دینے سے پہلے گورنر جنرل وزرتِ خزانہ سے اجازت لینے کے پابند ہیں۔قائداعظم نے اس پر باقاعدہ معذرت کی اور آرڈر منسوخ کر دیا

☆۔ریلوے پھاٹک والا قصہ کون نہیں جانتا۔جنرل گل حسن نے آپ کی گاڑی گزارنے کے لئے بند ریلوے پھاٹک کھلوایا۔آپ کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا۔

آپ نے یہ کہہ کر پھاٹک بند کرادیا کہ اگر میں ہی قانون کی پابندی نہیں کروں گا تو اور پھر کون کرے گا۔یہ تھے ہمارے قائد...جسے ہم سب نے قائداعظم کہہ کر پکارا اور اُسے مانا۔ذرا اُس کے عملی کردار اور اپنے محب الوطنی کا تقابلی جائزہ لیں تو حیرت ہوتی ہے۔کہ وہ فرشتہ صفت انسان جس کی ضد نے راست اقدام کر کے ہمیں ایک عظیم مملکت دے دی اور فخر سے برصغیر کے محروم، بسے ہوئے، اَن پڑھ طبقے کو سر چھپانے کے لئے ایک وطن مہیا کر دیا۔جسے بیش بہا لالچ دیئے گئے، بہت پیشکشیں کی گئیں، مگر اس نے محمد ﷺ کی برکت اور علی کی طاقت سے یہ عظیم چوٹی سر کی۔ہندو اور انگریز کے گٹھ جوڑ کے باوجود، اور علمائے سُو کی مسلسل مخالفت کے باوجود ہمیں ایک آزاد ملک کی نعمت سے نوازا۔اگر ہم اس کردار کا ایک ایک کر کے جائزہ لیں تو اس عظمت کردار کا عشرِ عشیر بھی آج ہم میں اور ہمارے نام نہاد لیڈران میں نہیں پایا جاتا۔

1۔فضول خرچی:

کیا آج کی کابینہ میں فضول خرچی سے اجتناب ہے، نہیں۔بلکہ ہر جگہ کروڑوں سے بجٹ بڑھ چکے ہیں۔اور بڑی ڈھٹائی سے قوم کا پیسہ اللّے تللّوں میں پانی کی طرح ضائع کیا جاتا ہے۔بلکہ حلوائی کی دکان پر نانا جی کی فاتح پڑھی جاتی ہے۔

2۔خریدنے سے پہلے فیصلہ اور اجازت:

کیا اس فضول خرچی کی کوئی روک تھام ہے بلکہ کوئی بھی چیز خریدنے پر کمیشن کھانا قانون بلکہ حق بن چکا ہے۔اپنی ذات کے علاوہ اپنے اَقرباء کو بھی اس بہتی گنگا میں نہلانے کی پوری پوری کوشش کی جاتی ہے۔ذاتی اشیاء تو درکنار بلٹ پروف گاڑیوں کی خرید پر کروڑوں روپے خرچ کئے جاتے ہیں۔

3۔استقبال یا اصول پرستی:

استقبال کے لئے تو ہم سگِ بیمار کی طرح دُم ہلاتے ہوئے بھی پہنچ جاتے ہیں۔اُن فرنگی اور سعودی ناخداؤں کے لئے تو ہم ایک کال پر بچھے جاتے ہیں کہ دنیا میں ہماری خوشامد گوئی اور چمچہ گیری کی مثالیں دی جاتی ہیں۔ہمارے ہاں اصول پرستی کو ترجیح نہیں دی جاتی۔

4۔اَقرباء پروری:

اَقرباء پروری میں تو ہم نے کمال حاصل کر لیا ہے، پہلے تو لیڈر اپنے بیٹے کو پروموٹ کرتے ہیں اگر بیٹا نہ ہو تو بیٹی کو اس بھٹی میں جھونکنے سے نہیں چوکتے۔اگر وہ

بھی نہ ہوتو بیوی، بھتیجے، سمدھی، اوران کے سمدھی رشتے دار بھی مفادات کی جنگ کے لئے آزمائے جاتے ہیں۔ پھر ہم مسلمان بن کر عہد فاروقی کی مثالیں دیتے نہیں تھکتے۔

5-تبادلوں کی سیاست:

تبادلوں کی سیاست نے تو ہمارا بیڑا ہی غرق کر دیا ہے۔ پولیس اور بیوروکریٹ ہمارے لیڈروں کے گھر کی باندی بن کر رہ گئے ہیں۔ جس ایم این اے یا وزیر کے پاس یہ طاقت نہ ہو اسے مفلوج وزیر تصوّر کیا جاتا ہے۔ بلکہ تبادلے کا تیر ہر بے کس بیوروکریٹ اور جج تک پر چلانے کی بھرپور کوشش کی جاتی ہے۔

6-وزارت خزانہ کا مقام:

وزارت خزانہ کو آزاد ادارہ بنانے کی بجائے اسے نکیل ڈال دی جاتی ہے۔ بلکہ اپنے سمدھی کو اس کا کرتا دھرتا بنا کر ہر سال کے دوران منی بجٹ لا کر قوم کی جیبیں تراشی جاتی ہیں۔ اور وزارت خارجہ کا قلمدان بھی اپنے ہاتھ میں رکھنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اور مسلسل اس کو مستقل وزیر مقرر کرنے سے گریز کر کے اختیارات اپنے ہاتھ میں رکھ کر اس محکمے کی تذلیل کیجاتی ہے۔ مداخلت سے بے توقیری کی جاتی ہے۔ جب مودی نے پاکستان آنا ہو تو میڈیا سے ہی وزارتِ خارجہ کو پتہ چلتا ہے۔

7-وی آئی پی کلچر:

اب پھاٹک تو ایک طرف، جب کسی معمولی وزیر نے بھی گزرنا ہو تو سڑکیں اور اس کے سگنل تین تین گھنٹے قبل ہی بند کر دیئے جاتے ہیں، وی آئی پی کلچر نے اس قوم کو پاگل کر دیا ہے۔ پچاس پچاس گاڑیوں کے قافلے، اور بے شمار پولیس کارندوں کی جمعہ جنج سڑکوں پر رش لگا کر غریب شہریوں کا جینا حرام کر رہی ہے۔ اس وجہ سے کئی بسمہ راستے میں دم توڑ جاتی ہیں اور کئی رکشہ خان ٹریفک رش میں ہی پیدا ہو جاتے ہیں۔ عمران خان نے تو اعلان کر دیا ہے کہ وہ خیبر پختون خواہ میں اس وی آئی کلچر کو ختم کر رہا ہے کاش باقی صوبے بھی کچھ سبق لیں۔ آخر میں دعا گو ہوں کہ اے خدا ہمیں ایک اور قائداعظم عنایت کر۔ جو ساری قوم کو وقار سے جینا سکھا دے۔ آمین۔

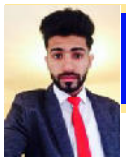

احمد فراز۔ بلال افتخار

آج 12 جنوری اُردو کے نامور شاعر ''احمد فراز'' کا یومِ ولادت ہے۔ شاعری کی دنیا میں ایک نمایا مقام رکھنے والے شاعر احمد فراز کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ انھوں نے شاعری کی دنیا میں داخل ہو کر اپنی پر لطف شاعری کی دھومیں مچا دی۔ اسلئے وہ آج بھی لوگوں کے دلوں میں اسی طرح موجود ہے۔ احمد فراز 12 جنوری 1931 کو کوہاٹ کے علاقے میں پیدا ہوئے اگر ان کے اصل نام کو دیکھا جائے تو ان کا اصل نام سید احمد شاہ تھا۔ جب انھوں نے شعر و شاعری میں قدم رکھا تو اپنے نام کے ساتھ فراز کا تخلص لگانا شروع کر دیا۔

مقبول شاعر کیفی اعظمی

رانا عبدالوحید خان

14 جنوری اردو کے معروف اور مقبول شاعر کیفی اعظمی کا یومِ ولادت ہے۔

کیفی اعظمی کا اصل نام اطہر حسین رضوی تھا اور وہ 14 جنوری 1919ء کو اتر پردیش کے ضلع اعظم گڑھ میں پیدا ہوئے تھے۔ کیفی اعظمی نے اپنی پہلی نظم 11 سال کی عمر میں تحریر کی۔ 19 سال کی عمر میں وہ بھارت کی کمیونسٹ پارٹی میں شامل ہو گئے۔ 1940 کے اوائل میں کیفی اعظمی بمبئی آ گئے اور صحافت کے شعبے سے منسلک ہو گئے یہیں ان کی شعری کا پہلا مجموعہ ''جھنکار'' شائع ہوا۔ قیام ممبئی کے دوران کیفی اعظمی نے لاتعداد فلموں کے لئے نغمے اور مکالمے لکھے، جن میں بزدل، کاغذ کے پھول، ہیر رانجھا، گرم ہوا، سات ہندوستانی، پاکیزہ، ہنستے زخم اور ارتھ کے نام سرفہرست ہیں۔ ان کے مقبول گیتوں میں فلم کاغذ کے پھول کا گیت ''وقت نے کیا کیا حسیں ستم'' پاکیزہ کا گیت'' یونہی کوئی مل گیا تھا، سرراہ چلتے چلتے''، ہیر رانجھا کا گیت ''یہ دنیا یہ محفل'' اور ارتھ کا گیت ''تم اتنا جو مسکرا رہے ہو'' شامل ہیں۔ ان کی غزلوں اور نظموں کی مقبولیت کی اصل وجہ ان میں جذبات کا بے پناہ اظہار، الفاظ کی خوبصورتی اور غیر منصفانہ معاشرے کے خلاف بغاوت کا عنصر تھا۔ اردو شاعری کے فروغ کے لئے انتھک کام کرنے پر انہیں ساہتیہ اکیڈمی ایوارڈ، ساہتیہ اکیڈمی فیلوشپ، پدم شری، نیشنل فلم ایوارڈ اور فلم فیئر ایوارڈ سے نوازا گیا، کیفی اعظمی معروف بھارتی اداکارہ شبانہ اعظمی کے والد اور شاعر جاوید اختر کے سسر تھے۔ کیفی اعظمی 10 مئی 2002 کو اس دنیا سے رخصت ہوئے۔ وہ ممبئی میں آسودہ خاک ہیں۔

تم اتنا جو مسکرا رہے ہو کیا غم ہے جس کو چھپا رہے ہو

رام ریاض

فراز حمید خان

13 جنوری اُردو کے نامور شاعر ''رام ریاض'' کا یومِ ولادت ہے۔ رام ریاض کا اصل نام ریاض احمد ہے۔ آپ 13 جنوری 1932ء کو پانی پت ھریانہ میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد کا نام شیخ نیاز احمد ھے۔ آپ نے 1945ء میں پرائمری کا امتحان محلہ انصاریاں پانی پت کے مدرسہ شاخِ انصاریاں سے پاس کیا۔ پھر ابھی مڈل کی تعلیم مکمل نہیں ھوئی تھی کہ ازادی کی صبح درخشاں طلوع ھوئی۔ اس گل رنگ سویرے میں رام ریاض محلہ گلاب والا، وارڈ نمبر 5 جھنگ شہر مین پہنچے۔ مڈل کا امتحان 1950ء میں حالی مسلم ہائی سکول جھنگ سے پاس کیا۔ میٹرک کا امتحان ایم بی ھائی سکول جھنگ سے

بطور ریگولر اسٹوڈنٹ 1953ء میں پاس کیا عالمی شہرت کے حامل نوبل انعام یافتہ سائنسدان پروفیسر عبدالسلام بھی اسی ادارے مین زیرِ تعلیم رھے۔رام ریاض کی شاعری کا آغاز ھائی سکول دور سے ھو چکا تھا۔میترک کے بعد رام ریاض نے گورنمنٹ وول سپننگ اینڈ ویونگ سنٹر جھنگ شہر میں داخلہ لے لیا۔ وہ یہاں 14 اپریل 1955ء سے 22 مئی 1957ء تک زیرِ تعلیم رھے۔اور یہاں سے وول ٹیکنا لوجی کا سپننگ ماسٹر ڈپلومہ کورس کامیابی سے مکمل کیا۔اس کے بعد صوبہ پختون خواہ کی ایک وول مل مین بحیثیت سپننگ ماسٹر ملازمت اختیار کر لی۔ یہ ان کی پہلی ملازمت تھی جلد ھی وہ ملازمت چھوڑ کر واپس جھنگ آ گئے اور تعلیم کا سلسلہ دوبارہ شروع کر دیا۔1965ء مین گورنمنٹ کالج جھنگ سے گریجویشن کا امتحان پاس کیا اس وقت تک آپ ریاض احمد شگفتہ کے نام سے معروو تھے۔آپ کی ڈگری پر بھی یہی نام درج ھے۔کچھ عرصہ بعد آپ نے اپنا قلمی نام رام ریاض اختیار کرلیا۔گریجویشن کے بعد رام ریاض نے اسلامیہ ھائی سکول خانیوال مین معلم کی حیثیت سے جاب اختیار کر لی معروف ادیب علی تنہا بھی اسی ادارے کے فارغ التحصیل ھیں۔جن کا ذکر رام ریاض بیحد محبت سے کرتے تھے۔ ملازمت کا یہ سلسلہ بھی زیادہ دیر نہ چل سکا۔اور آخر کار جھنگ واپس آ گئے۔اسی دوران میں ان کی شادی ھوگئی لیکن یہ شادی کامیاب نہ ھوسکی اور آخر کار انہوں نے اپنی بیوی کو طلاق دے دی۔مگر تنہائی اور بیروزگاری کا عفریت مسلسل ان کے سر پر منڈلاتا رھا۔فکرِ معاش نے ان کے تعلیمی کیریئر میں جس طرح رخنے ڈالے وہ ان کے امتحانات کی تواریخ سے عیاں ہے 1973ء میں محکمہ خاندانی منصوبہ بندی میں بحیثیت پبلسٹی آفیسر کے طور پر انہین جاب مل گئی یہ سلسلہ تقریبا4 برس تک جاری رھا اور بالآخر یہ ملازمت بھی تخفیف کی زد میں آ گئی۔اس کے ساتھ ہی رام ریاض کی بیروزگاری، اور اعصابی شکست وریخت کا ایک ایسا لرزہ خیز دور شروع ہوا جو ان کی معذوری اور بالآخر ان کی المناک اور حسرت ناک موت پر منتج ہوا۔1986ء میں ان کا پہلا مجموعہ کلام پیڑ اور پتے شائع ھوا۔10 جون 1986ء کو فالج کے شدید حملے نے اس توانا شاعر کو مستقل طور پر اپاہج بنا کر رکھ دیا۔زندگی کے آخری ایام میں رام ریاض انتہائی کسمپرسی کی حالت میں تھا بیماری، لاچاری اور بیروزگاری کا زہر اس کی نس نس میں اُتر چکا تھا گزر اوقات کا واحد ذریعہ اکادمی ادبیات کا 500 روپے ماہانہ وظیفہ تھا۔اپنی ضعیف ماں کے ساتھ جس طرح اس نے سانسیں گن گن کر اپنی زندگی کے دن پورے کئے وہ ہمارے لئے لمحہ فکریہ ھیں۔لیکن رام ریاض کبھی حرفِ شکایت زبان پر نہ لایا۔وہی سدا بہار مسکراہٹ اس کے لبوں پر رھتی اور اپنے داخلی کرب کا اظہار اپنے شعرون کے ذریعے کرتا۔اور پھر بالآخر یہ شاعر ایک دن تھک کے گر پڑا۔ 07 ستمبر 1990ء کو بے باک شاعر زندگی کی بازی ہار گیا۔اب یہ خوبصورت لب و لہجے کا شاعر جھنگ کے نواحی قبرستان میں آسودہء خاک ہے۔

نامور اُستاد شاعر خواجہ حیدر علی آتش

منور خورشید

۱۴ جنوری اردو کلاسکی شاعری کے نامور استاد شاعر خواجہ حیدر علی آتش کا یومِ وفات ہے۔خواجہ حیدر علی آتش 1778 کو فیض آباد میں پیدا ہوئے، ان کے والد نواب شجاع الدولہ کے عہد میں دلی چھوڑ کر فیض آباد آئے تھے، کم سنی ہی میں باپ کا سایہ سر سے اُٹھ گیا، باقاعدہ تعلیم سے محروم رہے، مناسب عمر کو پہنچے تو فیض آباد کے نواب مرزا محمد تقی کی ملازمت اختیار کی اور انھیں کے ساتھ لکھنؤ آئے، یہاں انہوں نے مصحفی کی شاگردی اختیار کی، طبیعت ایسی تیز تھی کہ بہت جلد بڑے شاعروں کی صف میں آ گئے، آتش کے چمکتے ہی لکھنؤ کے ادب شناس آتش اور ناسخ کے طرف داروں میں بٹ گئے، محمد حسین آزاد کے بقول دونوں میں ادبی معرکے بھی ہوئے لیکن یہ معرکے تہذیب کے دائرے میں رہے۔چشمک کے باوجود آتش اور ناسخ ایک دوسرے کا احترام کرتے تھے، آتش نے دربار اور امیروں سے الگ تھلگ نہایت سادہ، آزاد زندگی بسر کی، وضع درویشانہ تھی، عموما گیروا کپڑا پہنتے، ہاتھ میں موٹا ڈنڈا اور کمر سے تلوار لٹکی رہتی تھی۔ مزاج میں وضعدار اور خودداری کے ساتھ انکسار اور خوش خلقی بھی تھی۔ آخری عمر میں انکھیں جاتی رہی تھیں۔آتش کی شاعری بنیادی طور پر لکھنؤ کے اسی انداز پر مبنی ہے جس کو ناسخ نے رواج دیا تھا۔لیکن اس میں تصوف اور درویشی کی چنگاریاں بھی بجا ملتی ہیں۔آتش کے کردار میں جو بانک پن اور گرمی تھی وہی ان کے کلام میں بھی ملتی ہے۔ان کے کلام میں بول چال کی زبان، رنگ، محاورات برمحل ہیں۔ان کے کلام نے پسند خاص اور قبول عام کی سند حاصل کی۔آتش کے کلام میں میر کی طرح کی کیفیت نہیں، لیکن آمد کا تاثر ان کے یہاں بہت ہے۔

معلوم ہوتا ہے شعر بنتے چلے آ رہے ہیں۔ان کے بہت سارے اشعار ضرب المثل ہو گئے ہیں۔ بندش کی چستی اور الفاظ کی برجستگی میں آتش کو ناسخ پر فوقیت حاصل ہے، آتش کی کلیات پہلی بار نول کشور پریس لکھنؤ سے شاؤ ہوئی، پھر اسی پریس نے متعدد ایڈیشن شائع کیے۔ چہار شنبہ 25 محرم الحرام ھ بمطابق 14 جنوری 1846ء کی صبح کو خواجہ حیدر علی آتش اپنے مکان مسکونہ واقع معالی خاں کی سرا متصل نالہ چھجو رنگریز میں فوت ہوا محلہ نخاس کنگھی والوں میں دفن ہیں، نشان قبر موجود ہے۔ بہت سے لوگوں نے خواجہ حیدر علی آتش کی وفات پہ بہت اچھی اچھی تاریخیں لکھیں مگر رشک کی تاریخ سے واقعہ، دن، تاریخ، وقت نیز اخلاق وسیرت پر بھی روشنی پڑتی ہے۔قطعہ ملاحظہ ہو: خواجہ و آتش تخلص، نام شاں حیدر علی۔صبح روز چار شنبہ بود، مردند از قضا۔رشک صوری معنوی بنوشت تاریخ وفات۔ از محرم بست وپنجم صبح، ہے ہے اربعا۔کتابیات

۔کلیاتِ آتش (1873ء) نولکشور پریس کانپور (1929ء) نولکشور لکھنؤ۔ دیوان آتش (1840) آتش پر لکھے گئے مقالات۔ مقالات پی ایچ ڈی۔ ۱۹۷۳ء، آتش لکھنوی کی شاعری، ڈاکٹر شعیب راہی، پٹنہ یونیورسٹی پٹنہ 1976ء، دبستان آتش، ڈاکٹر شاہ عبدالسلام نگران ڈاکٹر شبیہ الحسن نونہروی، لکھنؤ یونیورسٹی لکھنؤ۔ ۱۹۷۶ء، آتش اور اُردو شاعری کی ترقی میں اُن کا حصہ نگران ڈاکٹر شبیہ الحسن نونہروی، لکھنؤ یونیورسٹی لکھنؤ۔ مقالات ایم فل۔ ۱۹۸۹، آتش کی غزل گوئی، رضوانہ نگران ڈاکٹر اشفاق محمد خاں، جواہر لعل نہرو یونیورسٹی دہلی۔

حفیظ جالندھری

اعزاز لطیف خان

14 جنوری قومی ترانے کے خالق ''حفیظ جالندھری'' کا یومِ ولادت ہے۔ پاکستان کو قومی ترانے جیسا بیش قیمتی سرمایہ نواز کر امر ہو جانے والے حفیظ جالندھری 14 جنوری 1900 کو پنجاب کے شہر جالندھر میں پیدا ہوئے۔ ملکی خراب حالات کے باعث وہ اپنی تعلیم جاری نہ رکھ سکے اور ان کی اکیڈمک ایجوکیشن ساتویں جماعت تک ہی محدود رہی۔ اس کے باوجود انہیں خدا نے ایسی پوشیدہ صلاحیتوں سے نوازا تھا کہ صرف سات سال کی عمر میں اپنا پہلا شعر کہا اور پہلی غزل چھٹی جماعت میں کہی۔ ادبی تعلیم کے لیے قادرالکلام فارسی کے معروف شاعر مولانا غلام قادر بلگرامی کی شاگردی اختیار کی۔ قیام پاکستان کے بعد لاہور تشریف لائے اور پھر آخری دم تک لاہور کو رہائش کا اعزاز بخشا۔ ایک وقت آیا کہ افواج پاکستان میں ڈائریکٹر جنرل آف مورالز اور امور کشمیر مقرر ہوئے انہیں حکومت پاکستان کی جانب سے ہلال امتیاز اور حسن کارکردگی کے صدارتی ایوارڈ سے بھی نوازا گیا۔ حفیظ جالندھری کا ناقابل فراموش کارنامہ شاہ نامہ اسلام کا تخلیق ہونا تھا جو ادب میں ہمیشگی اختیار کر گیا حفیظ جالندھری نے کئی مشہور گیت، غزلیں اور نظمیں بھی کہیں جن میں نغمہ زار، سوز و ساز شامل ہیں۔ افسانوں کا مجموعہ ہفت پیکر کے نام سے چھپا ایک معلومات افزا کتاب چیونٹی نامہ بھی لکھی۔ حفیظ جالندھری کا دوسرا بڑا کارنامہ پاکستان کا قومی ترانہ ہے اس ترانے کی تخلیق کی وجہ سے وہ ہمیشہ یاد رکھے جائیں گے۔ 21 دسمبر 1982 کو قلیل علالت کے بعد حرکت قلب بند ہو جانے سے وہ خالق حقیقی سے جا ملے اور انہیں مینار پاکستان کے سائے تلے دفن کیا گیا۔

دانشور پروفیسر احمد علی

سید حسن خان

۱۴ جنوری انگریزی اور اردو کے ممتاز ادیب، نقاد اور دانشور پروفیسر احمد علی کا یومِ وفات ہے۔ پروفیسر احمد علی دہلی میں پیدا ہوئے تھے۔ انہوں نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز افسانہ نگاری سے کیا تھا۔ ان کا ایک افسانہ افسانوں کے مشہور اور متنازع مجموعے انگارے میں بھی شامل تھا۔ یہ وہی افسانوی مجموعہ ہے جس پر بعد ازاں پابندی لگا دی گئی تھی اور جسے اردو کی ترقی پسند تحریک کے آغاز کے اسباب میں شمار کیا جاتا ہے۔ پروفیسر احمد علی کی تصانیف میں ہماری گلی، شعلے اور قید خانہ کے علاوہ انگریزی زبان میں لکھی گئیں۔

Muslim China, Ocean of Night, The Golden Tradition, Twilight in Delhi اور Of Rats and Diplomats.

کے نام شامل ہیں۔ پروفیسر احمد علی نے قرآن پاک کا انگریزی ترجمہ بھی کیا تھا جو اشاعت پذیر ہو چکا ہے۔ حکومت پاکستان نے انہیں ستارہ قائداعظم کا اعزاز عطا کیا تھا۔ پروفیسر احمد علی 14 جنوری 1994ء کو کراچی میں وفات پا گئے اور گلشن اقبال کے قبرستان میں آسودہ خاک ہوئے۔

ابنِ انشاء

ساجد محمود رانا

11 جنوری اُردو زبان کے منفرد شاعر اور نثر نگار ''ابن انشا'' کا یومِ وفات ہے۔ ابن انشا کا اصل نام شیر محمد خان، اور تخلص انشاء تھا۔ آپ 15 جون 1927 کو جالندھر کے ایک نواحی گاؤں میں پیدا ہوئے۔ 1946ء میں پنجاب یونیورسٹی سے بی اے اور 1953ء میں کراچی یونیورسٹی سے ایم اے کیا۔ 1962ء میں نیشنل بک کونسل کے ڈائریکٹر مقرر ہوئے۔ ٹوکیو بک ڈویلپمنٹ پروگریم کے وائس چیرمین اور ایشین کو پبلی کیشن پروگریم ٹوکیو کی مرکزی مجلس ادارت کے رکن تھے۔ روزنامہ جنگ کراچی، اور روزنامہ امروز لاہور کے ہفت روزہ... ایڈیشنوں اور ہفت روزہ اخبار جہاں میں ہلکے پھکے کالم لکھتے تھے۔ ابنِ انشاء شاعر بھی ہیں' ادیب بھی۔ انہوں نے غزلیں' نظمیں اور گیت لکھے۔ شاعری میں ان کا ایک مخصوص انداز ہے۔ وہ کبھی کبیر داس کا لہجہ اختیار کرتے ہیں اور انسان دوستی کا پرچار کرتے ہوئے نظر آتے ہیں اور ایک انسان کو دوسرے انسان سے محبت کا سبق دیتے ہیں۔ کہیں اپنے اشعار میں زندگی کی اداسیوں' محرومیوں اور دکھوں کا میر تقی میر کی طرح اظہار کرتے ہیں اور کہیں نظیر اکبر آبادی کی طرح علاقائی اور عوامی انداز اختیار کرتی ہیں اور بڑی سادگی' روانی اور عوامی زبان میں

عوام کے احساس کو اردو ادب کا جامہ پہناتے ہیں۔نثر کے میدان میں انہوں نے طنز نگاری کا انداز اختیار کیا۔طنز میں مزاح کی آمیزش نے ان کی تحریروں کو زیادہ پراثر بنا دیا۔عوام سے قریب ہونے کے لئے انہوں نے اخبارات میں کالم نویسی کا آغاز کیا' سفرنامے لکھے'اس طرح اپنے مشاہدات اور تجربات کو طنز ومزاح کے پیرائے میں بیان کرکے شہرت حاصل کی۔ اردو ادب کی ان مختلف اصناف میں ابنِ انشا نے بڑا نام کمایا۔طبیعت کی جولانی اور شگفتگی' مزاج کی حس لطافت وظرافت اور طنز کی تراش و خراش' غرضیکہ سب ہی کچھ ان کی تحریروں سے نمایاں ہے۔ابن انشاء سرطان جیسے موذی مرض کا شکار ہوکر بغرض علاج لندن گئے اور 11 جنوری 1978 کو وہیں وفات پائی۔ وفات کے بعد انہیں کراچی میں دفن کیا گیا۔ابن انشاء اس وقت ہمارے ساتھ موجود نہیں مگر ان کی یادیں چاہنے والوں کو دلوں میں زندہ ہیں۔

شفیق الرحمان

محمد ابراہیم عابد

10 جنوری معروف صداکار،گلوکار،کمپیئر اور پروڈیوسر،شفیق الرحمان کا یوم وفات ہے۔شفیق الرحمان 27 ستمبر 1963ء کو صادق آباد،ضلع رحیم یارخان میں پیدا ہوئے۔ سکول کی تعلیم صادق آباد میں حاصل کی۔ پھر وہ اپنے والدین کے ہمراہ کراچی منتقل ہو گئے جہاں انہوں نے اسلامیہ کالج سے بی اے کیا۔اسکے بعد کراچی سکول آف آرٹس سے کمرشل آرٹس کی تعلیم حاصل کرنے کے بعد شفیق الرحمان نے جناب جون ایلیا کے عالمی ڈائجسٹ میں بطور سکیچ آرٹسٹ اپنی عملی زندگی کا آغاز کیا۔ملازمت کے ساتھ شفیق الرحمان مختلف کلچرل شوز،ورائٹی پروگرامز اور پاکستان ٹیلیویژن پر کمپیئرنگ اور گلوکاری بھی کرتے رہے۔ پی ٹی وی کے لیے شفیق نے کئی یادگار ڈرامے بھی پرڈیوس کیے۔اپنی عمدہ آواز کی وجہ سے شفیق نے صداکاری کو بطور پیشہ اپنایا اور اس میں بیحد کامیاب رہے۔آج بھی ٹیلیویژن پر نشر ہونے والے اسّی فیصد اشتہاروں میں شفیق الرحمان کی آواز ہی شامل ہے۔شفیق کی آواز میں غالباً سب سے زیادہ مقبول کردار کمانڈر سیف گارڈ کا ہے۔ وہ گلوکار کی حیثیت سے بھی بہت کامیاب رہے اور بے شمار البمز متعارف کروائیں۔اُن کا سب سے زیادہ پسند کیا جانے والا نغمہ ''زندگی کو گزار کے لی'' ہے جو اپنے دور کی طرح آج بھی سامعین میں بیحد مقبول ہے۔شفیق الرحمان ہیپاٹائٹس سی کا شکار ہوئے اور صرف پینتالیس برس کی عمر میں 10 جنوری 2008ء کو کراچی میں انتقال کر گئے اور کراچی ہی میں آسودہ خاک ہوئے۔

> فقط ایک کا ہونے میں ہی حسن بندگی ہے غالبؔ
> جو روز قبلہ بدلتے ہیں وہ بے دین ہوتے ہیں

اعتزاز حسن

ثقلین مبارک

جنوری ہنگو اسکول پر خودکش حملہ ناکام بنانے والے اعتزاز حسن کی دوسری برسی تھی۔حکومت پاکستان کی جانب سے ستارہ شجاعت اور ہیرالڈ میگزین کی جانب سے ہیرو آف دی ائیر کا اعزاز پانے والا اعتزاز احسن کی شہادت کو ایک برس بیت گیا۔گزشتہ برس چھ جنوری میں ہنگو کے اسکول پر خودکش حملہ کرنے کی کوشش کی گئی لیکن جاں باز اعتزاز نے حملہ ناکام بنا دیا تھا۔ہنگو کے علاقے ابراہیم زئی سے تعلق رکھنے والا اعتزاز احسن چھ جنوری کی صبح آٹھ بجے اپنے دیگر دوستوں کے ساتھ اسکول جارہا تھا کہ اسے راستے میں ایک اجنبی شخص اپنے اسکول کی طرف بڑھتا دکھائی دیا۔ جو دہشت گرد تھا۔وہ دہشت گرد اسکول کے گیٹ تک پہنچا تھا لیکن اعتزاز نے اپنے جان کی پرواہ نہ کرتے ہوئے اسے قابو کیا۔ دہشت گرد نے خود کو دھماکے سے اڑالیا۔ساتھ میں اعتزاز حسن کی بھی شہادت ہوئی لیکن اس نے اپنی جان دے کر سیکڑوں ماوں کی گودیں اجڑنے سے بچا لیں۔اسکول میں اس وقت اسمبلی ہورہی تھی اور کم از کم 2000 بچے اور اساتذہ موجود تھے۔اعتزاز حسن کو سال 2014 کے لیے ہیرالڈ کی بہترین شخصیت منتخب کیا گیا ہے۔ 16 دسمبر کو پشاور اسکول پر کیے گئے بہیمانہ حملے کے بعد اعتزاز کی قربانی کو مزید سراہا گیا۔بشکریہ اب تک ٹی وی۔

حفیظ ہوشیار پوری

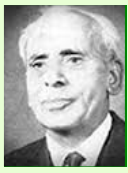

سردار۔فضل عمر ڈوگر

جنوری اُردو کے معروف شاعر ''حفیظ ہوشیار پوری'' کا یومِ وفات ہے۔حفیظ ہوشیار پوری کا اصل نام شیخ عبدالحفیظ سلیم تھا۔وہ 5 جنوری 1912ء کو دیوان پور،ضلع جھنگ میں پیدا ہوئے تھے مگر اپنے آبائی وطن ہوشیار پور کی نسبت سے ہوشیار پوری کہلائے۔ وہ گورنمنٹ کالج لاہور کے فارغ التحصیل تھے اور حلقہ ارباب ذوق کے پہلے سکریٹری ہونے کا اعزاز بھی رکھتے تھے۔وہ تعلیم مکمل کرنے کے بعد آل انڈیا ریڈیو سے وابستہ ہوئے اور پھر تمام عمر اسی ادارے میں جس کا پاکستانی حصہ قیام پاکستان کے بعد ریڈیو پاکستان کہلانے لگا تھا' گزار دی۔حفیظ ہوشیار پوری نے ابتدا میں نظمیں بھی لکھیں اور منظوم تراجم بھی کیے مگر ان کی شناخت ان کی غزل گوئی اور ان کی تاریخ گوئی بنی۔انہوں نے لیاقت علی خان کی شہادت کی تاریخ علامہ اقبال کے مشہور مصرعے ''صلہ شہید کیا ہے تب وتاب جاودانہ'' سے نکالی جو اس فن پر ان کے کمال دسترس کی آئینہ دار ہے۔حفیظ ہوشیار پوری کا مجموعہ کلام ''مقام غزل'' ان کی وفات کے بعد شائع ہوا۔10 جنوری 1973ء کو وہ طویل علالت کے بعد کراچی میں وفات پا گئے۔ وہ کراچی میں پی ای سی ایچ سوسائٹی کے قبرستان میں آسودہ خاک ہیں ان کی لوح مزار پر انہی کا یہ شعر کندہ ہے۔سوئیں گے حشر تک کہ سبکدوش ہوگئی....بار امانت غم ہستی اتار کے۔

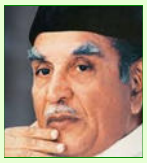

حکیم محمد سعید

بشارت احمد خان

۹ جنوری پاکستان کے نامور طبیب، مصنف اور سماجی رہنما حکیم محمد سعید کا یوم ولادت ہے۔حکیم محمد سعید 9 جنوری 1920ء کو دہلی میں پیدا ہوئے تھے۔ان کے والد حافظ عبدالمجید نے 1906ء میں ہمدرد دواخانہ کی بنیاد ڈالی تھی۔کم سنی میں والد کا سایہ سر سے اٹھنے کے بعد ان کے بڑے بھائی حکیم عبدالحمید نے ان کی تعلیم و تربیت کی۔ 1939ء میں انہوں نے طبیہ کالج دہلی سے طب کا اعلیٰ امتحان پاس کیا اور ہمدرد دواخانہ کے کاموں میں اپنے بڑے بھائی کا ہاتھ بٹانے لگے۔قیام پاکستان کے بعد وہ کراچی آ گئے اور یہاں ہمدرد دواخانہ کی ازسرنو بنیاد رکھی جو دیکھتے ہی دیکھتے پاکستان کا ایک عظیم طبی، علمی، ادبی، تعلیمی، اشاعتی اور اسلامی ادارہ بن گیا۔حکیم محمد سعید نے ہمدرد دواخانہ کے علاوہ اور بھی کئی ادارے قائم کیے جن میں مدینۃ الحکمت کا نام سرفہرست ہے۔حکیم محمد سعید صدر پاکستان کے طبی مشیر اور صوبہ سندھ کے گورنر کے عہدے پر بھی فائز رہے۔انہوں نے بچوں کے رسالے ''نونہال'' سمیت کئی جریدے جاری کیے اور لاتعداد تصانیف یادگار چھوڑیں۔حکومت پاکستان نے ان کی خدمات کے اعتراف کے طور پر 1966ء میں انہیں ستارہ امتیاز اور 2000ء میں نشانِ امتیاز عطا کیا تھا۔17 اکتوبر 1998ء کو حکیم محمد سعید کراچی میں نامعلوم افراد کی گولیوں کا نشانہ بن گئے۔وہ کراچی میں مدینۃ الحکمت کے احاطے میں آسودہ خاک ہیں۔

اخبارات ورسائل کے فکر انگیز اقتباسات

شذرات

مکرم شیخ نسیم صاحب

نفاذ اسلام:

جناب انور صاحب مذکورہ بالا عنوان کے تحت لکھتے ہیں:

اگر ''نفاذ اسلام'' کے بعد ہمارے عوام کی زندگی کا معیار ''کفار'' سے بہتر نہیں ہوتا تو پھر شاید ہمارا تصور اسلام ادھورا اور خام ہے۔یہ کیسے ممکن ہے کہ آپ بحیثیت حکمران رعایا کے حقوق تو ادا نہ کریں اور ان سے فرائض کی انجام دہی کا تقاضا کریں؟ خود تو لینڈ کروزروں پر پھریں اور عوام کے پاس بس پر بیٹھنے کی سکت بھی نہ ہو۔خود تو قصر ہائے اقتدار میں متمکن ہوں، مگر غریب مسلم عوام اور اقلیتوں کے پاس رہنے کو جھونپڑا بھی میسر نہ ہو، تو کیا ہم اسلام ایسے دین رحمت کو صرف سزاؤں کا مجموعہ تصور کرتے ہیں؟ کیا جج کو قاضی کہہ دینے سے عدالتی نظام کی بدعنوانی ختم ہو جائیگی؟ عوام کو انصاف مل جائے گا؟ سب سے پہلے عوام کے حقوق پورے کیجئے۔ایک بھوکے کو یہ حق حاصل ہو کہ وہ چوری کرنے سے پہلے چیف منسٹر ہاؤس کے داروغہ مطبخ سے ہفت خوان نعمت طلب کر سکے تو پھر چوری کے جرم میں اس کے دونوں ہاتھ کاٹ دیجئے۔اگر عورتوں کے سائن بورڈ توڑنے، سرکسوں کو آگ لگانے اور عوام کی ثقافت کو اسلام کا دشمن ڈکلیئر کرنے سے مہنگائی کم ہو سکتی ہے تو فوراً بسم اللہ کیجئے۔اگر زندگی کی ہر سہولت سے محروم عوام کی پیٹھ پر درے برسانے سے قومی پیداوار بڑھ سکتی ہے تو پھر اس عمل پر کسی کو کیا اعتراض؟ اگر سڑکوں پر صرف یا رحیم اور یا جبار لکھ دینے سے دین الٰہی کے سارے تقاضے پورے ہو سکتے ہیں تو پھر دیر نہ کیجئے۔اگر یوں ممکن نہیں تو پھر لمحہ بھر کو سوچئے کہ کیا ہم کہیں کسی اور سمت میں تو نہیں چل نکلے؟.....تاریخ اس بات پر متفق ہے کہ جزا و سزا کا نظام خلیفہ دوم حضرت عمرؓ کے دور میں نافذ ہوا اور یہ بھی حقیقت ہے کہ انہوں نے اس کا رنیک کا آغاز اپنی ذات سے کیا۔بندے رہے ایک طرف، انہوں نے اپنی فرماں روائی میں ایک کتے کے بھوکے رہ جانے پر بھی اللہ کے سامنے جوابدہی سے خوف کھایا۔یہ واقعہ بھی انہی سے منسوب ہے کہ جب وہ مصر کے سرکاری دورے پر نکلے تو ان کے ساتھ کوئی محافظ دستہ تھا اور نہ کوئی شاہانہ جاہ وجلال ،صرف ایک اونٹ تھا اور ایک عدد غلام، وہ سارا راستہ غلام کے ساتھ باری باری اونٹ پر سوار ہوتے رہے، تاکہ نہ غلام کی حق تلفی ہو اور نہ بے زبان جانور کو دو آدمیوں کا بوجھ بیک وقت اٹھانا پڑے۔نصابی کتب میں بچوں کو یہی پڑھایا جاتا ہے کہ جب وہ اپنی منزل پر پہنچے تب ان کا غلام اپنی باری کے مطابق اونٹ پر سوار تھا اور حضرت عمرؓ اس کی نکیل تھامے اس کے آگے چل رہے تھے۔اور یہ بات بھی کہیں ثابت نہیں ہوتی کہ ان کے دور میں پہلوانوں کی کشتیوں، شعراء کے مشاعروں، گھڑسواری اور شتر سواری کے مقابلوں، شادی بیاہ یا موت مرگ کے رواجوں پر قدغن لگائی گئی ہو۔اسلام نے عام آدمی کی ثقافت سے کچھ تعرض نہیں کیا۔اس نے صرف اخلاقی نقائص کو دور کر دیا۔کہیں جلاؤ گھیراؤ نہیں کیا، کہیں جبر کا ڈنڈا چلایا اور نہ انسان کو ماضی میں واپس دھکیلنے کی سعی کی۔

(روزنامہ ''خبریں'' لاہور 9 جون 2003ء)

اسباب زوال

جناب رفیق ڈوگر صاحب

جناب رفیق ڈوگر صاحب ایک خطیب کے وعظ پر جس میں انہوں نے اسلامی تعلیمات کے حوالے سے غربت مٹانے کا نسخہ بیان فرمایا تھا۔تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔''کیا یہ نسخہ ہمارے حکمرانوں، رہنماؤں اور مذہبی جماعتوں کے قائدین کو بھی معلوم ہے؟ ایک نوجوان نے چند روز پہلے مجھے فوڈ سٹریٹ کا ایک واقعہ بتایا ایک مذہبی جماعت کے ایک بہت بڑے قائد اسلام اپنے باڈی گارڈوں کے ساتھ فوڈ سٹریٹ

کھانا کھانے گئے تو گاڑی تو ظاہر ہے ان کے ہم مرتبہ ہی تھی پوری فوڈ سٹریٹ کا چکر لگایا اور ایک رحمانی شاپ پسند فرما کر وہاں مٹی کے پیالے میں پانی پینے کی سنت پر عمل کیا میں نے تو آج تک فوڈ سٹریٹ نہیں دیکھی اخباروں میں اس ''عیاشی'' کے بارے میں ہی پڑھا سنا ہے۔ سوچتا ہوں علمائے کرام کو گارڈوں اور کئی کئی لاکھ کی گاڑیوں کی کیوں ضرورت ہوتی ہے؟ ان کیا خراجات وہ کہاں سیادا کرتے ہیں؟ کیا اس بارے میں کبھی کسی نے ان سے پوچھا ہے؟ ان کے ٹیکس کے گوشوارے کسی نے کبھی دیکھے ہیں؟ جس دین کو ہم مانتے ہیں اللہ کے جس رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے لائے نظام کے نفاذ کو ہم سب مصائب سے نجات کا راستہ بتاتے ہیں کیا اس میں اس کی اجازت ہے؟ اگر نہیں تو پھر ہم ایسا کیوں کرتے ہیں؟.....

شاہ ولی اللہ کا ایک فرمان پڑھ کر میں کئی روز پریشان رہا۔ برصغیر میں مسلمانوں اور ان کی حکومت کے اوال کے اسباب میں.....شاہ صاحب فرماتے ہیں: ''علماء کرام بیت المال سے وظائف لینا اپنا حق سمجھنے لگے ہیں اور ''ویلیاں کھاتے ہیں'' بیت المال پر پلنے والے کسی پیداواری عمل میں حصہ نہیں لیتے جس سے امت کو نقصان پہنچتا ہے حکمران جرنیل امیر وزیر نمود و نمائش کے مرض میں مبتلا ہو گئے ہیں۔ بڑے بڑے محلوں میں رہتے ہیں۔

محبت کے بیج — آج کی دُنیا

شاہ مراکش کی تخت نشینی کے دس سال

اشتیاق حسین

مراکو پر اس وقت فرانس کا تسلّط تھا اور فرانسیسی اسے اپنی ایک نوآبادی کا حصّہ سمجھتے تھے۔ مراکو کے موجودہ بادشاہ کے دادا مرحوم محمد ﷺ کی قیادت میں مراکش کی فرانس سے آزادی کی تحریک جاری تھی 1952ء میں اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل کے ایک اجلاس کے موقعپر محمد ﷺ کی طرف سے بھیجے گئے آزادی کے اہم لیڈر احمد عبدالسلام بل فرجسی کی وریٹی کونسل میں مراکوک آزادی کے لئے بولنے کھڑے ہوئے تو فرانسیسی نمائندے نے انہیں یہ کہہ کر منع کر دیا کہ مراکش پر فرانس کا تسلط ہے، اس لئے احمد عبدالسلام بن لفرج کو اس پلیٹ فارم پر بولنے کی اجازت نہیں۔ اسی کیوریٹی کونسل کے اس اجلاس میں پاکستان کے پہلے وزیر خارجہ سر ظفر اللہ خان نے جب ایک مسلم ملک کے ساتھ فرانس کا یہ رویہ دیکھا تو انہوں نے احمد عبدالسلام بن لفرج کو فوری طور پر نیویارک میں واقع پاکستانی سفارت خانے سے پاکستانی پاسپورٹ جاری کروایا اور انہیں پاکستانی شہری کے طور پر پاکستان کی چیئر سے اپنا کیس پیش کرنے کا موقع فراہم کیا، اس کے بعد مراکو کی آزادی کی تحریک نے زور پکڑا، 28 اگست 1953ء کو محمد ﷺ نے مڈغاسکر میں جلاوطنی اختیار کر لی اور وہاں سے تحریک کو جاری رکھا۔ 16 نومبر 1955ء میں مراکو واپس آئے۔ اس تحریک کے نتیجے میں مراکو کو 19 نومبر 1965ء میں فرانس کے تسلط سے آزادی حاصل ہوئی۔ بادشاہ محمد V نے احمد عبدالسلام بن لفرج کو مراکو کا پہلا وزیرِ اعظم نامزد کیا۔ مراکش کے شہر رباط میں قائم پاکستانی سفارتخانہ بھی احمد عبدالسلام ب لفرج کے نام سے منسوب شاہراہ پر واقع ہے۔ گزشتہ سال مراکش میں متعین پاکستان کے سفیر جناب رضوان الحق نے 51 سال پرانے پاسپورٹ کی فوٹو کاپی احمد عبدالسلام ب لفرج کو پیش کی جسے دیکھ کر وہ ششدر رہ گئے اور انہوں نے پاسپورٹ کی کی یہ کاپی اپنے دفتر میں آویزاں کی۔ وہ دفتر میں آنیوالے ہر شخص کو بڑے فخر سے بتاتے ہیں کہ مراکش کی آزادی کی مہم کے دوران پاکستانی پاسپورٹ نے میری بڑی مدد کی۔ مراکشی تحریک آزادی کی لئے پاکستان کی کاوشوں کو بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور وہ پاکستانیوں سے بے پناہ محبت کرتے ہیں۔ مراکش سے میرا لگاؤ بچپن میں اس وقت شروع ہوا جب میری والدہ نے سونے قبل مجھے تاریخی کہانیاں سنایا کرتی تھیں جن کے کردار اکثر اسلامی ہیروز ہوتے تھے۔ ان میں سے جس کہانی نے مجھے سب سے زیادہ متاثر کیا وہ مراکش سے تعلق رکھنے والے اس عظیم اسلامی سپہ سالار طارق بن زیاد کی تھی جو 711ء میں اپنی فوج کے ہمراہ کشتیوں میں سوار ہو کر اسپین کو فتح کرنیکی غرض سے روانہ ہوا۔ اس کی فوج کی تعداد قلیل تھی لیکن وہ پرعزم اور جذبہ اسلامی سے سرشار تھی۔ اس نے اسپین سے ملحقہ جبلا لطارق (Gibraltar) پہنچ کر ان کشتیوں کو جن پر وہ سوار ہو کر آئے تھے جلا ڈالا اور اس موقع پر اپنی تاریخی تقریر میں کہ ''ہمارے سامنے دشمن اور پشت پر سمندر ہے، ہم اپنی کشتیاں جلا چکے ہیں، اسلئے واپسی اَب ممکن نہیں۔'' طارق بن زیاد کے ان الفاظ کو فوج نے شہادتی افتح کے طور پر تعبیر کی اور میدان کارزار میں ہمت و شجاعت کی وہ داستانیں رقم کیں جو رہتی دُنیا تک یاد رکھی جائیں گی۔ طارق بن زیاد کی فتح یورپ میں اسلام کی آمد کا سبب بنی اور کئی سو سال تک مسلمانوں نے یورپ پر حکومت کی۔ آج بھی وہاں مسجد قرطبہ، غرناطہ کے محلا اور مسلم طرزِ تعمیر کا شاہکار عمارتیں مسلمانوں کے اس سنہری دور کی یاد تازہ کرتی ہیں۔ اس وقت جب میرے دوست یورپ اور امریکہ جانیکی خواہش رکھتے تھے مُجھے اس کے برعکس ایک تاریخی مسلم ملک مراکش جانے کی خواہش تھی۔ جب میں پہلی بار مراکش گیا تو مراکش کے شہر تنجیر سے کشتی کے ذریعے جبل الطارق گیا، جونہی مَیں نے پہلا قدم استاریخی مقام پر رکھا تو مُجھے بچپن میں سنائی گئی کہانیوں کی یاد تازہ ہوگئی۔ آج بھی اس مقام پر صدیوں پہلی طارق بن زیاد کیدَور کی بعض نشانیاں موجود ہیں۔ مراکش اور وہاں کے لوگ مجھے اس قدر پسند آئے کہ مَیں نے یہاں بزنس شروع کر دیا جو آج تک کامیابی سے چل رہا ہے۔ کی دہائی میں جب مَیں مراکو میں مقیم تھا، اس وقت حکومت پاکستان نے مُجھے وہاں اعزازی قونصل جنرل کی تقرری کے احکامات جاری

کئے۔ سال میں کئی بار میرا مراکش آنا جانا رہتا ہے۔ اس طرح مراکش میرا دوسرا گھر بن گیا ہے، آج میں پاکستان میں مراکو کا اعزازی قونصل جنرل کی حیثیت سے فرائض انجام دے رہا ہوں۔ یہ میرے فرائض منصبی میں شامل ہے کہ دونوں ممالک کے مابین سفارتی اَور باہمی تعلقات کو فروغ دیا جائے جس کے لئے میں کوشاں ہوں۔ گزشتہ دنوں مراکش کے بادشاہ محمد VI کی تخت نشینی کی دسویں سالگرہ کی تقریبات مراکش میں بڑے جوش وخروش سے منائی گئیں دنیا بھر میں قائم مراکش کے سفارتخانوں میں بھی اس طرح کی تقاریب منعقد ہوئیں۔ اس سلسلے کی ایک تقریب 30 جولائی کو کراچی کیا یک مقامی فائیو اسٹار ہوٹل کے خوبصورت لان میں کی جسے پاکستان کے سبز ہلالی اور مراکش کے کے سرخ پرچموں سے سجایا گیا تھا۔ تقریب میں کراچی میں متعین سفارت کاروں، کراچی میں مقیم مراکشی لوگوں اَور دیگر اہم شخصیات نے شرکت کی۔ تقریب کا آغاز دونوں ممالک کے قومی ترانوں سے کیا گیا اَور اس موقع پر کیک جس پر پاکستان اور مراکش کے پرچم بنے ہوئے تھے کاٹا گیا۔ مراکش اور پاکستان میں تاریخی اعتبار سے مماثلت پائی جاتی ہے۔ 711ء میں جب نوجوان سپہ سالار طارق بن زیاد اپنی کشتیاں جلا کر فتح شہادت کا اعلان کر رہا تھا اَور فتح کی صورت میں مسلمانوں نے کئی سو سال یورپ میں حکومت کی۔ اسی وقت یک اور نوجوان سپہ سالار محمد بن قاسم دیبل کے قلعہ پر فتح کا اسلامی پرچم گاڑ رہا تھا جس کے نتیجے میں پورے برّصغیر میں اسلام پھیلا اَور مسلمانوں کی حکومت قائم ہوئی۔ پاکستان سے ہر سال لاکھوں افراد یورپ اَور امریکہ کی سیاحت کے لئے جاتے ہیں اسکے باوجود وہاں ان سے اکثر تحقیر آمیز سلوک کیا جاتا ہے اَور انہیں شک کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے مسلم ممالک کو بڑے حسن سے نوازا ہے۔ مراکش ایک نہایت خوبصورت اسلامی ملک ہے اَور دُنیا بھر کے سیاحوں کے لئے کشش کا باعث ہے۔ ہمیں چاہئے کہ سیاحت کے حوالے سے اُن ممالک کو ترجیح دیں تا کہ اسلامی ممالک میں سیاحت کو فروغ ہو اَور مسلمانوں کو ایک دوسرے کے قریب آنے کا موقع میسر آ سکے۔

کاجو۔خوش ذائقہ میوہ

مامور احمد

کاجو جنوبی ہند کے جنگلوں میں کاشت کیا جاتا ہے۔ اسکے درخت کی بلندی دس سے بارہ میٹر ہوتی ہے۔ اس درخت سے زردی مائل گوند نکلتی ہے۔ اس کی شاخوں سے چار انگشت ٹوپی جیسی کلی نکلتی ہے پھر اس میں پھل نکلتا ہے جس کی پیوند چوڑی ہوتی ہے۔ سر پتلا اور بے نوک ہوتا ہے۔ اس پھل کا چھلکا بہت نرم ہوتا ہے جو اوپر سے سرخ اور زردی مائل ہوتا ہے۔ اس کا مغز میٹھا ہوتا ہے اس پھل کے نیچے دو رگیں کو خطوں کی طرح نکلتی ہیں ان دونوں کے درمیان دو بیج بندھے رہتے ہیں۔ جن کی شکل گودے جیسی رہتی ہے۔ جس کا مزہ لذت سے بھرپور ہوتا ہے۔ کھانے میں بادام سے مشابہت رکھتا ہے۔ یہی کاجو ہے۔

کاجو کی برفی برصغیر کی ایک پسندیدہ مٹھائی ہے۔ جو بہت لذیذ ہوتی ہے۔ سو گرام کاجو میں سو حرارے اور 51 فی صد گرام چکنائی ہوتی ہے ہائی بلڈ پریشر کے مریض کو نمکین کاجو سے پرہیز کرنا چاہیے۔ یہ صحت بخش خوش میوہ ہے کیونکہ اس میں کولیسٹرول نہیں ہوتا۔ یہ ذیابطیس دور کرنے میں بھی مددگار رہتا ہے۔ کاجو کے بیج میں ایسے قدرتی اجزا پائے جاتے ہیں جو خون میں موجود انسولین کو عضلات کے خلیوں میں جذب کرنے کی بھرپور صلاحیت رکھتے ہیں۔ اسکے علاوہ اس میں کیلشیم، میگنیشیم، اور تانبا کافی مقدار میں موجود ہے۔ (ماہنامہ ڈالڈا دسمبر 2015ء)

پاک وطن کے دُشمن کو پہچانو

(عاصی صحرائی لندن)

پاکستان بنتے ہی حضرت قائد اعظمؒ نے اس کے خدوخال واضح کر دیئے تھے۔ مگر بعد میں آنے والوں نے اُس کی رُوح کو نہیں سمجھا۔ کیونکہ علم میں کمی کے باوجود مذہب پرستی کا عنصر شامل ہو گیا۔ میثاقِ مدینہ کی رُوح کو نہ جاننے والے کم علم اپنی عقلی برتری کو ثابت کرنے کے لئے منفی کوششوں میں شامل رہے۔ کیونکہ باقی عوام ، اَن پڑھ اور جاہل تھے۔ اور علمائے سُو جو گاندھی جی کو رسول کا درجہ دیتے تھے وہ اس ملک کے ازلی دشمن بن گئے۔ کچھ انگریز کے وفادار نکلے کیونکہ ان کے ابا نے اور خود انہوں سے جو جاگیریں لی تھیں اس کا حق نمک ادا کرنے کے لئے آزادی کے خلاف بہت وفاداری دکھائی۔ جمیعت علمائے ہند، جماعت اسلامی، جماعت احرار، خاکسار، بلکہ سب مدنی، آزاد، مودودی، سرحدی گاندھی، اس وطن پاک کے دُشمن تھے۔ اُن لوگوں نے اس ملک کے خلاف ایڑی چوٹی تک زور لگایا، ذرا تاریخ تحریک پاکستان پڑھیئے تو آپ کو ان علمائے سُو کے کردار اور کرتوتوں کا پتہ چلے (میرا کسی سیاسی پارٹی سے تعلق نہیں)، پاکستان میں داخل ہوتے ہی ان علمائے سُو نے اپنے منفی ارادے پورے کرنے کے لئے اسلام اسلام کی رٹ لگا کر ۱۹۵۳ء میں مارشل لاء لگانے کی ناکام کوشش کی، درجنوں لوگ مر گئے، اور ملک کا امن برباد ہوا۔

پھر ایوب خان کے مداح بن کر دربار تک رسائی حاصل کرنے کے ناکام کوشش کی۔

اس کے بعد عورت کی حکمرانی کے خلاف فتویٰ دینے والی جماعتوں نے بھی فاطمہ جناح کو ایوب خان کے خلاف الیکشن لڑوایا، اور منہ کی کھائی۔ جب کچھ نہ بن سکا تو یحییٰ خان کو نجات دہندہ مان کر ان علمائے سُو نے اسے اشیر باد دے کر بنگلہ دیش کے

منصوبے کو مکمل کیا۔ اور ڈھاکہ میں اسلامی تنظیموں کے نام سے بنگالیوں کا قتل عام کروایا، ۱۹۷۰ء میں بھٹو کے خلاف الیکشن لڑا۔ اور اس کے خلاف جب فتاویٰ کی گولہ باری بھی کارگر ثابت نہ ہوئی تو سب اسلامی حلقوں نے شکستِ فاش کھائی۔ جب بھٹو جیت گیا بھاری اکثریت کے ساتھ تو علمائے سُو نے اس کو رام کرنے کے لئے براستہ سعودیہ راہ اختیار کیا۔ ۱۹۷۴ء میں ایک کلمہ گو اور محب وطن فرقے کے خلاف سازش تیار کر کے اسے ناٹ مسلم قرار دلوایا۔ جب یہ کام ہو گیا تو پھر بھٹو کو نا کام کرنے کے لئے انتخابات میں دھاندلی کا شور مچا کر ضیاء الحق سے مارشل لاء لگوایا۔ قومی اتحاد اور نوستاروں کی شکل میں علمائے سُو کی نیتیں کھل کر قوم کے سامنے آئیں۔ ضیا ع الحق کی حکومت دراصل جماعت اسلامی اور علمائے سُو ہی کی حکومت تھی۔ اپریل ۱۹۸۵ء میں ان علمائے سُو ہی نے جماعت احمدیہ مسلمہ کے خلاف یزیدی قوانین بنوائے۔ جس سے اُن پر نماز، قرآن، اذان پڑھنے پر پابندی لگ گئی حتیٰ کہ مسجد کو مسجد کہنے پر تین سال قید با مشقت تھی۔ جو ان علمائے سُو کی سب سے بڑی خدمت اسلام تھی۔ پھر ان علمائے سُو نے ضیاع الحق کا درباری بن کر، اور سعودیہ کا گماشتہ بن کر شیعہ کمیونٹی کو قتل عام کروایا، مدرسے، اور سکول خون میں نہلا دیئے گئے۔ طلباء تنظیموں کو اسلحہ بردار اور خدائی فوجدار بنا دیا گیا، کالج اور یونیورسٹیاں اسلحہ خانہ بن گئیں۔ اور وہاں سے کئی متشدد لیڈر مثلاً جاوید ہاشمی، فرید پراچہ، بلوچ، ریاض بسرا وغیرہ پیدا ہوئے۔ جنہوں نے تشدد کی سیاست کی۔ اور قوم کو تشدد کی تربیت دی، اور فوج سے مل کر جہادی پیدا کرنے کے لئے جہاد افغانستان کو پروموٹ کیا۔ بذریعہ حکومت ساری دنیا سے مجاہدین کو بلا کر جہاد افغانستان کی جنگ میں جھونک دیا۔ اور ضیاع الحق کو مجاہد کے لقب سے نواز کر سعودیہ اور امریکہ کی اشیر باد سے روپیہ بھی کمایا اور اپنی نوکری بھی ان علمائے سُو نے پکی کر لی۔ پھر خدا نے ضیاع الحق کی صف لپیٹ کر اسے فی النار کر دیا۔ تو پھر عورت کی حکمرانی کا پراپیگنڈہ ہونے لگا۔ عوام کے پرزور دباؤ پر اقتدار پر بے نظیر آ تو گئی مگر پھر جنرل گل نے آئی جے آئی بنا کر منظور نظر نواز شریف کو وزیر اعظم بنا ڈالا۔ ان علمائے سُو جو ہمیشہ ابن الوقت کا کردار ادا کرتے رہے ہیں، اسی طرح سارے ادوار میں آنکھ مچولی کھیلتے رہے ہیں۔ پھر ان علمائے سُو نے افغانستان کے جاہل اور سادہ لوح مسلمانوں کو ایسا ورغلایا کہ اسلام کا تصور بدل کے رکھ دیا۔ اور طالبان کی حمایت میں ان علمائے سُو کیا کیا گل کھلائے۔ سعودیہ اور اسلامی ممالک کی مدد سے ان علمائے سُو نے ہزاروں مدرسے بنا کر قوم کے نوجوانوں کو ورغلایا، اور سب کو خودکُش بمبار بنا کر رکھ دیا، اب تو پنجاب اور سارے دیگر صوبوں میں بھی یہ وبا پھیل چکی ہے، جس کا علاج مشکل تر ہے، اسلام کے یہ ٹھیکیدار ہیں، ساری قوم کو اسی گروہ نے ورغلا کر اغوا کر لیا ہے، قوم کو چاہیئے کہ کوئی مصطفیٰ کمال پاشا پیدا کرے، ترکی کی طرح اس گند سے ملک پاک کو پاک کرے۔ ہم مسلمان ہیں مگر انتہا پسند نہیں، ہم مسلمان ہیں مگر قاتل نہیں، ہم مسلمان ہیں مگر منافق نہیں، اسلام میں داڑھی ہے مگر داڑھی میں اسلام نہیں۔ جو داڑھی رکھ لیتا ہے وہ مولانا بن جاتا ہے مگر ہوتا ہے دہشت گرد۔ ہم نیک علمائے کرام کا احترام کرتے ہیں ہم صرف بات اُن کی کرتے ہیں جن کا قول و عمل ایک نہیں۔ جو اسلام کو استعمال کرتے ہیں جو عجیب عجیب فتاویٰ دیتے ہیں ظالمان کو شہید اور فوج کے جوانوں کو شہید نہیں کہتے۔ جن لوگوں نے خود کو اسلام کا اجارہ دار بنا رکھا ہے۔ جب تک ہم سب نے سنجیدگی سے اپنے مادر وطن کا نہ سوچا تو ہم اسی طرح بدنام ہوتے رہیں گے اور ساری دنیا ہمارا مذاق اُڑاتی رہے گی۔ ہم مسلم کو انسان سمجھتے ہیں اور غیر مسلم کو انسان بھی نہیں سمجھتے۔ کافروں کو نامعلوم کن کن القابات سے پکارتے ہیں جب خود آئینہ دیکھتے ہیں تو ساری قوم کو ایک دوسرے سے گھن آتی ہے۔ کون سی اچھائی ہم میں ہے۔ کچھ بھی تو نہیں ہے ہم میں۔ ہم جو ملے بغیر سوچے سمجھے کھا جاتے ہیں، گدھا ہو، کسی کا مال ہو، ملاوٹ والی کوئی چیز ہو، حرام مال ہو، رشوت ہو، یتیم کا مال ہو، نہ جانے ہم کیا ہیں۔ ہمارے پاس کوئی مستند قوائد نہیں قرآن ہے تو اسے ہم پڑھتے نہیں، خدا کو ہم مانتے ہیں مگر خدا کی ایک نہیں مانتے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

غزل:: خواب نگر جب ہوتے ہیں آباد

بزمِ انجم رومانی پاکستان کے زیرِ اہتمام ''شگفتہ غزل ہاشمی کے نام ایک شام'' اور ذاکر خواجہ کی ۶۵ ویں سالگرہ کا انعقاد

حسیب اعجاز عاشر

شگفتہ غزل ہاشمی کا شمار دنیائے شعر و ادب کی خوش نصیب شخصیات میں ہوتا ہے، انکے ہاشمی خاندان کی ادبی خدمات کا اعتراف ہر سطح پر کیا جاتا ہے۔ شگفتہ غزل کے والدِ محترم نقش ہاشمی (مرحوم) کو استاد شعراء میں خاص مقام حاصل تھا، جن کی مقبول ترین کتب میں ''صحیفہ جنگ''، ''صحیفہ ملت''، ''مرادِ مصطفیٰ''، ''غماں دا پتن'' اور ''ارژنگ'' شامل ہیں جبکہ انکے مجموعہِ غزلیات، تاریخ لاہور اور سوشل مسائل کے حوالے تین کتب زیرِ طباع ہیں۔ اِسکے علاوہ نقش ہاشمی نمبر بھی شائع ہو چکا ہے جس میں مایہ ناز ادبی شخصیات کے پُرمغز اور منظوم مکالے شامل ہیں۔ انکی شاعری پر تھیسس بھی لکھے جا چکے ہیں۔ شگفتہ غزل کے بھائی اختر ہاشمی عہدِ حاضر کے معروف شاعر و ادیب، جن کے تعارف میں اتنا کہنا ہی کافی ہے کہ آپ اپنا تعارف ہوا بہار کی ہے۔ پنجابی اور اُردو ادب کے حوالے سے انکی خدمات بیشمار ہیں، پہلا پنجابی مجموعہ کلام ۱۹۷۳ میں شائع ہوا انکے تین مجموعہ کلام، ایک نثری مجموعہ اور ایک سفرنامہ شائع ہو چکے ہیں اور بابر شکیل ہاشمی بھی اپنی شاعری سے اہل ذوق احباب کی سماعتوں کو راحت بخش رہے ہیں۔ انکی بہن محترمہ رضوانہ سحر ہاشمی کے مجموعہ کلام بھی ادبی لائبریری کی زینت بن چکے ہیں جس میں ''دھوپ کا آنچل'' ادبی حلقے میں خوب پسند کیا گیا ہے، جبکہ رفعت ناہید ہاشمی،

رفعت شمیم ہاشمی اور عفت نوید ہاشمی کے مجموعہ کلام بھی زیرِ طباع ہیں۔شگفتہ غزل کا ایک بیٹا بحیثیت آرٹسٹ اپنے جوہرِ فن دیکھانے میں مصروف دوسرا پروڈیکشن میں کامیابی کے سفر پر۔ انکا مجموعہ کلام ''تتلیوں کے تعاقب میں'' بھی ادبی حلقوں میں خوب پذیرائی حاصل کر رہا ہے، فروغِ اُردو ادب کے حوالے کئی تنظیموں سے وابستہ اپنی پُرخلوص خدمات پیش کرنے میں فعال کردار ادا کر رہی ہیں، رب جلیل نے انکے مقدر میں مظہر جعفری جیسا ایسا محبت کرنے والا شاعر و ادیب ہمسفر بھی لکھ دیا، جو انکے ادبی شوق کو خوب جلا بخش رہے ہیں، بے شمار اعزازت انکا مقدر بن چکی ہیں۔شگفتہ غزل ہاشمی نے زمانہ طالب علمی ہی میں اپنے قلمی سفر کا آغاز کر دیا تھا اور ۷۳۔۱۹۷۲ میں اخبار، امروز، مشرق اور مساوات میں قلم و قرطاس کے ساتھ بچوں کے ادب کے حوالے سے خوب انصاف کیا۔جبکہ میٹرک میں انکا پہلا افسانہ ''غم کے سائے'' بھی شائع ہوا۔کالج میں قدم رکھا تو انٹر کالجیٹ طرحی مشاعروں سے اپنی شاعری کا بھی باقاعدہ آغاز کر دیا۔بہترین اداریہ لکھنے پر کالج میگزین ''محمل'' کی ایڈیٹر مقرر کر دی گئیں۔انہیں اسی کم عمری میں ہی احمد ندیم قاسمی، مستنصر حسین تارڑ، سعادت سعید اور مسٹر اینڈ مسز امجد اسلام امجد جیسی نامور شخصیات کے انٹرویوز کرنے کے اعزاز بھی حاصل ہوا۔انہیں بہترین، مدیرہ، بہترین شاعرہ اور بہترین صحافی کے اعتراف میں تعریفی شیلڈ و اسناد سے نوازا گیا۔''جیونی آبروئے دیدہ تر شوق شہادت''، ''ناسور برزخ''، ''برگِ آوارہ''، ''شوقِ پرواز'' اپنے دور کے مقبول ترین افسانے میں شمار ہوئے۔ادبی ماحول میں پرورش پانی والی محترمہ شگفتہ غزل ہاشمی میدان شعروادب میں اپنے منفرد لب ولہجہ اور دلکش کلام کے باعث مسلسل پسندیدگی کی اسناد وصول کر رہی ہیں۔ترنم ناز نے کلامِ شگفتہ ''دل جھلا ہر روز کریندا اپنے نال صلاحواں۔۔ہن نئیں دسنے دکھ کسے نوں ہن نئیں بھرنیاں ہاواں'' گایا تو اہل ذوق جھوم اُٹھے۔شگفتہ غزل ہاشمی کا مجموعہ کلام ''تتلیوں کے تعاقب میں'' اہل ذوق احباب کے لئے کسی حسین تحفے سے کم نہیں۔''تتلیوں کے تعاقب میں'' شگفتہ غزل کے سچے جذبوں کی سچائیوں کا انتہائی شگفتہ و نرم لہجے میں بے ساختہ اظہار ہے۔نظم ہو یا غزل شگفتہ کی دلفریب ادبی ہنر مندیاں ساری اصنافِ شعری میں بہت نمایاں ہیں جو قاری کو متاثر کئے بغیر نہیں رہنے دیتیں۔شگفتہ کی غزلیات اپنی علامتوں، استعاروں اور اشاراتی اسلوب کے ذریعے آشوب کی منزل کو پہنچان لیتی ہیں۔جہاں انہوں نے اپنے کلام میں درد وغم کے تمام ذائقوں کو سمو دیا ہے جس کا ذائقہ ہر سخن فہم اور زبان شناس بخوبی محسوس کرسکتا ہے۔انہوں نے چشمِ احساس، غمِ تنہائی، فکرِ انسانیت، غمِ جدائی، غمِ ہجراں جیسی ترکیبوں میں اپنی انفرادیت قائم کر کے اپنے اشعار کو شہکار بنا کر قاری کو اپنی تازہ کاری کا یک گونہ احساس بھی دلایا ہے۔عطاء الحق قاسمی ''تتلیوں کے تعاقب میں'' پر اپنے تبصرے میں لکھتے ہیں کہ شگفتہ فطری شاعرہ لگتی ہیں اسی لئے شعری نزاکتوں کا خیال رکھتی ہیں انکی شاعری کسی محدود موضوع کی اسیر بھی محسوس نہیں ہوتی بلکہ اس میں ہمارے عصری مسائل اور کومل جذبے ایک ساتھ نظر آتے ہیں۔شگفتہ غزل ہاشمی کے خوبصورت اشعار اہلِ ذوق قارئین کی نذر...

ہر شکل میں سقراط نظر آتا ہے گویا
ہر شخص نے زہرِ غمِ حالات پیا ہے
یہ زخم کچھ ایسا ہے کہ بھرتا ہی نہیں ہے
اُدھڑا ہے کئی بار کئی بار سلا ہے

چند روز قبل ہی چوپال، ناصر باغ لاہور میں بزمِ انجم رومانی پاکستان کے زیرِ اہتمام ''شگفتہ غزل ہاشمی کے نام ایک شام'' اورالحبیب ادبی فورم پاکستان کے چیئرمین سینئر صحافی خواجہ ذاکر کی ۶۵ ویں سالگرہ کا انعقاد کیا گیا۔میزبان محفل بزمِ انجم رومانی کے صدر ڈاکٹر ایم ابرار کی خوبصورت نظامت نے محفل کو چار چاند لگا دیئے۔فلم ڈائریکٹر، کہانی نویس و شاعر نزر علی فرتاش کی زیرِ صدارت اس تقریب کا آغاز تلاوات قرآن پاک سے ہوا جسکی سعادت علامہ خورشید کمال کے حصے میں آئی ،عمرانہ انعم نے پُرسوز آواز میں پُرعقیدت نعت ﷺ پیش کی اور روحوں کو سکون بخشا۔تقریب میں سعد اللہ شاہ، شبنم مرزا، جاوید شیدا، مظہر جعفری، اختر ہاشمی، مقصود چغتائی، عدل منہاس، قریشی مظہر، علامہ عبدالستار، علی میرا، عاشق راحیل، جاوید شیدا، عاصم بخاری، پروفیشر عاشق راحیل، ابتیاج، منشاء قاضی، گلزار بخاری، گلشن عزیز، طینوش فردوس، ڈاکٹر ایم ابرار، مظہر قریشی، ناصر چوہدری، سلیم مجوکہ سمیت شہر کی قد آوار ادبی شخصیت نے شرکت کی۔۔مقررین نے تقریب کی مناسبت سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ شگفتہ غزل کی شخصیت وفن کی بدولت ہی اس تقریب میں ادبی شخصیات کشاں کشاں کچھی آئیں ہیں۔انہوں نے ہاشمی خاندان کی خوب لاج رکھی ہے انکا گھرانا ادب کے حوالے سے آفتاب ومہتاب کی حیثیت رکھتا ہے۔انکی فکر بھی شگفتہ ہے اور غزل بھی۔انہوں نے خوبصورت تقریب کے انعقاد پر ڈاکٹر ایم اے ابرار کی کاوش کو سراہا اور خواجہ ذاکر کو انکی ۶۵ ویں سالگرہ کی دلی مبارکباد بھی پیش کی۔ اور اس امید کا بھی اظہار کیا ایسی خوبصورت محافل کے انعقاد کا سلسلہ جاری رہے گا۔شگفتہ غزل نے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے اپنے ادبی سفر پر روشنی ڈالی اور نامور شعراء کے ساتھ اپنے دلچسپ ادبی تعلقات کا تذکرہ بھی کیا۔انہوں نے مہمانانِ خصوصی اور تمام حاضرین کی شرکت پر تہہ دل سے اظہار تشکر بھی کیا۔مہمانِ اعزازی خواجہ ذاکر نے بھی اپنے اظہار خیال میں منتظمِ محفل ڈاکٹر ایم اے ابرار اور تمام شرکاء کا شکریہ ادا کیا اور اپنے لئے دعاِ صحت کی اپیل بھی کی۔نزر علی فرتاش نے اپنے صدارتی کلمات پیش کرتے ہوئے ہاشمی خاندان کی ادبی خدمات کو خراجِ تحسین پیش کیا اور شگفتہ غزل کے کامیاب شعری سفر پر دلی مبارکباد بھی پیش کی اور خواجہ ذاکر کو بھی انکی سالگرہ پر ڈھیروں دعائیں دیں انہوں نے کامیاب تقریب کے انعقاد پر بزمِ انجم رومانی

پاکستان کو تعریفی کلمات سے نوازا۔شگفتہ غزل ہاشمی کو پھولوں کے گلدستے پیش کئے اور خواجہ ذاکر کی سالگرہ کے حوالے سے کیک بھی کاٹا گیا۔اختتام پر شرکاء ٹھنڈی شام میں چوپال کی گرما گرم چائے سے لطف اندوز بھی ہوتے رہے۔شگفتہ غزل ہاشمی کی ایک منتخب غزل پیش خدمت ہے۔

کتنے سندر جگمگ کرتے موتی اشک
پگلی لڑکی پہروں بیٹھ سنجوتی اشک
سینچ رہی تھی اپنے خون سے کشتِ جاں
کیا کاٹے گی یونہی رہی جو بوتی اشک
جیون رات اندھیری اور آنکھیں دیپک
بھیگے بھیگے سے نینوں کی جوتی اشک
سوچ رہی تھی وقت کی چوکھٹ پر بیٹھے
کاش ستارہ بن جاتی نہ ہوتی اشک
خواب نگر جب ہوتے ہیں آباد غزلؔ
ناگن راتیں لمحہ لمحہ روتی اشک

آفاتِ سماوی !

سید حسن خان

آتش فشاں پہاڑوں کا پھٹنا!۔نمبر ا۔1883ء انڈونیشیا کے شہر کراکاٹبوا Kara Katoba میں آتش فشاں پھٹنے سے ہلاکتوں کی تعداد 36,000 تھی۔جس کی طاقت 13,000 نیوکلیئر بم کے برابر تھی۔جس کی آواز 300 میل تک سُنی گئی۔نمبر ۲۔1980ء ماؤنٹ سینٹ ہیلنز امریکہ میں آتش فشاں کا لاوا 15 میل تک پھیل گیا اور پہاڑوں سے پتھروں کی بارش 15 میل تک ہوئی جس سے لوگ تو صرف 57 ہلاک ہوئے مگر اس کا نقصان بہت ہوا۔

زلزلوں سے تباہی

نمبر ا۔1556ء Shenzi شینزی چین میں زلزلہ آنے سے 8,30,000 افراد ہلاک ہوئے۔یہ زلزلہ تاریخ کا بدترین زلزلہ کہلاتا ہے۔جس نے 20 میٹر تک زمین میں سوراخ کر دیئے۔اور سینکڑوں میل تک کی عمارتیں گر کر تباہ ہوگئیں۔

نمبر ۲۔1906ء sanfransisco میں زلزلہ آنے سے 3000 افراد ہلاک ہوگئے۔جس سے آدھے سے زیادہ شہر تباہ ہوگیا اور عمارتوں میں آگ لگ گئی۔

نمبر ۳۔2010ء Port au-Prince-Haiti میں زلزلہ سے 230000 افراد ہلاک ہوگئے۔زلزلہ صرف 30 سیکنڈ کا تھا مگر اس سے سارا شہر تباہی کا شکار ہوگیا۔

سونامی (Sonami) سے تباہی

نمبر ا۔1755ء Portugal Lisbon میں بحر اوقیانوس میں سمندر کے اندر زلزلہ کے سونامی آنے سے 40,000 افراد ہلاک ہوئے۔طوفانی لہروں سے بچنے کیلئے لوگ گھروں سے باہر دوڑے مگر باہر طوفانی لہروں کا شکار ہوگئے۔

نمبر ۲۔26 دسمبر 2004ء Indian Ocean میں سمندر کے اندر زلزلہ آنے سے سمندری لہروں سے 230,000 افراد ہلاک ہوئے۔یہ سونامی بھی دنیا کی بدترین سونامی کہلاتی ہے۔جس کی لہریں 30 میٹر تک بلندی تھیں۔جس پر بعد میں اس کی تباہی پر فلم بھی بنائی گئی۔

نمبر ۳۔2011ء جاپان میں سونامی آنے سے 16000 افراد ہلاک ہوئے۔یہ دنیا کا ساتواں بڑا سمندر میں آنے والا زلزلہ تھا جس سے سونامی لہریں پیدا ہوئیں۔سمندری لہروں کی بلندی 7 میٹر تھی۔سمندری لہروں کے ٹکرانے سے جاپان کے تین بڑے نیوکلیئرز پلانٹس پگھل گئے۔

زمین کے پھسلنے (Landslides) سے تباہی

زمین، پہاڑوں یا کیچڑ کے یک دم پھسلنے اور زمین کے یکدم ٹوٹنے سے جو تباہی آتی ہے وہ لینڈ سلائڈ کہلاتی ہے۔جس سے بڑی تباہی آجاتی ہے۔دراصل لینڈ سلائڈ آتش فشاں کے پھٹنے یا زمین پر یا زمین کے اندر زلزلہ آنے سے سبب بن سکتی ہے۔دوسری بڑی وجہ سیلاب یا طوفان آنے سے لینڈ سلائڈ آسکتی ہے۔ایک اور بڑی وجہ لوگوں کا بے وجہ درختوں کے کاٹنے سے بھی لینڈ سلائڈ آسکتی ہے۔

نمبر ا۔1920ء Kansaou چین میں لینڈ سلائڈ سے 180,000 افراد ہلاک ہوئے۔جس سے سینکڑوں گاؤں ملیامیٹ ہوگئے۔

نمبر ۲۔1963ء Vagont اٹلی میں لینڈ سلائڈ سے 2,000 افراد ہلاک ہوگئے۔

نمبر ۳۔1970ء Yungay Peru میں لینڈ سلائڈ سے 20,000 افراد ہلاک ہوگئے۔(National Disasters By Mr.Tim Collins)

ملکہ وکٹوریہ 1819ء تا 1901ء

عامر سہیل مانچسٹر

الیگزنڈرینا وکٹوریا 24 مئی 1819ء کو کنگسٹن پیلس لندن میں پیدا ہوئیں۔وکٹوریہ کے والد کا نام شہزادہ ایڈورڈ تھا۔جو کینٹ اور سٹراتھرن کا ڈیک تھا اور شہنشاہ جارج سوم کا چوتھا بیٹا تھا۔دونوں باپ بیٹے کی وفات 1864ء میں ایک ہفتہ کے اندر ہوئی۔وکٹوریہ کی والدہ سیکس کوبرگ سافیلڈ کی شہزادی تھی جو دراصل وکٹوریہ (جرمن نژاد اور بیوہ تھی۔وکٹوریہ کی والدہ اس کی بہتر پرورش اور تربیت کی لئے شاہی خاندان سے الگ ایک علیحدہ جگہ پر رہتی تھی جہاں اسے شاہی رسم ورواج کے علاوہ فرنچ، جرمن، اٹالین زبانیں بھی سکھائی جاتی تھیں۔وکٹوریہ کے تین بڑے بھائی تھے

جوسب کے سب کم سنی میں ہی فوت ہوگئے جس کے بعد تخت برطانیہ کا کوئی بادشاہ امیدوار نہ بچا تھا۔وکٹوریہ کی والدہ نے اس کی اچھی تربیت کی جس کی وجہ سے جون وکٹوریہ عوام میں خاصی مقبول تھی۔چنانچہ 1837ء کووکٹوریہ سلطنت ِبرطانیہ اورآئرلینڈ کی ملکہ بنی اور تا وفاتعرصہ 64 سال تک اس تخت پر متمکن رہی ۔یکم مئی 1876 کو اس تخت کا دائرہ کار اور وسیع ہوگیا جب وہ ہند بھی بن گئی۔ملکہ وکٹوریہ نے 1840ء میں اپنے فرسٹ کزن البرٹ سے شادی کی جو سیکس برگ کا شہزادہ تھا۔ان کے ہاں نو بچے پیدا ہوئے۔جن کی شادیاں سارے براعظم کے مختلف شاہی اورمعزز خاندانوں میں طے پائیں۔جس کی وجہ سے اسے یورپ کی دادی اماں کہاجانے لگا۔

ملکہ کی پانچ بیٹیوں اور چار بیٹوں کے نام یہ ہیں۔ملکہ پیدائش 21 نومبر 1840ء،وفات 15اگست 1901ء۔2ایلس پیدائش25اپریل1843ء وفات 14دسمبر 1874ء 3ہیلینا پیدائش 25 مئی 1846ء وفات 9جون 1923ء ، 4لوئز پیدائش 18مارچ 1848ء وفات 3دسمبر 1939ء 5 بیٹرکس پیدائش 14اپریل 1857ء وفات 26اکتوبر 1944ء 6۔ایڈورڈ ہفتم پیدائش 9نومبر 1841ء وفات 6 مئی 1901ء۔7الفرڈ پیدائش 6اگست 1844ء وفات 30جولائی 1900ء 8۔آرتھر پیدائش یکم مئی 1850ء وفات 16جنوری 1942ء 9۔لیو پولڈ پیدائش 7اپریل1853ءوفات28مارچ1884ء۔

1861ء میں اپنے خاوندالبرٹ کی وفات کے بعدوکٹوریہ کوشدید صدمہ ہوااوراس نے عوام میں نمودار ہونا بند کردیا جس کی وجہ سے ریپبلکن پارٹی نے زور پکڑنا شروع کردیا۔لیکن اس نے اپنے آپ کو پھر سے سنبھالا اورایک بار پھرعوام میں شہرت پاگئی۔جس کا ثبوت اس کی گولڈن اورڈائمنڈ جوبلی کی تقریبات ہیں جوعوام میں جوش وخروش سے منائی گئی۔20جون 1887ء کو50سال مکمل ہونے پر گولڈن جوبلی منائی گئی۔جس میں یورپ بھر سے بادشاہ اورشہزادے شاہی دعوت میں شامل ہوئے۔ملکہ وکٹوریہ کا64سالہ دورکسی بھی برطانوی وکٹوریہ کا حکمران کا سب سے زیادہ بڑادورتھاجس وجہ سے اسے وکٹورین عہد کہاجاتا ہے۔یہ دوراپنی طاقت ،شہرت اوراثرورسوخ میں اپنی انتہا پرتھاجس میں صنعتی،ثقافتی،سیاسی،سماجی،سائنسی اورعسکری شعبہ جات میں نمایاں تبدیلیاں دیکھنے میں آئیں۔جس کی بدولت سلطنت برطانیہ کی توسیع عمل میں آئی۔ملکہ وکٹوریا کی وفات 82 سال کی عمر میں 1901ءکواوزربورن میں ہوئی۔جبکہ تدفین فرگمورونڈسر میں ہوئی۔ملکہ کی بہت سی یادگاریں موجودہیں۔ مثلاً آسٹریلیا کے ایک صوبے کا نام وکٹوریا ہے افریقہ میں ایک جھیل اورایک آبشار کا نام وکٹوریہ ہے۔لّلی کے خاندان میں ایک بڑے پتوں والے پودے کا نام وکٹوریہ ہے۔برطانیہ کے سب سے بڑے فوجی اعزاز کا نام وکٹوریہ کراس ہے۔کراچی کے ایک میوزیم اور بہاولپور کے ہسپتال کا نام وکٹوریہ ہے وغیرہ وغیرہ۔

دنیائے ادب میں ایک قابل قدر اضافہ!

اختر ضیائی۔ چیئرمین ''ایشین لٹریری سرکل'' لندن

پچھلے دنوں ''ایشین لٹریری سرکل والتھم سٹولندن کی ایک لندن نشست میں معروف کہانی کار امجد علی مرزا نے اپنی ایک تخلیق ''احساس ندامت'' کے عنوان سے پیش کی۔جس میں ان کی پوری فنی مہارت سنور کر سامنے آ گئی جس کو حاضرین نے پورے انہماک اورتوجہ سے سنا اور تدریجی مراحل میں قدم قدم پر مصنف کا ساتھ دیتے ہوئے طلسمی فضا سے پوری طرح لطف اندوز ہوئے۔جیسا کہ موضوع سے ظاہر تھا کہ افسانہ نئی نسل کے کردار پر درون خانہ تربیت اور باہر کے سماجی اور معاشرتی اثرات سے مرتب ہونے والے خدوخال کے اختلاف و اختلاط کے نقش و نگار کی عکاسی پر مشتمل تھا' جو عمیق مشاہدہ' باریک بینی اور خوبصورت جذبات نگاری کا نتیجہ تھی' یہی وجہ تھی کہ افسانے کا ہر نقطہ بیشتر معین کے روزمرہ کے تجربات کا حصہ محسوس کیا گیا اوردل کھول کر داد دی گئی۔امجد مرزا کے افسانے برصغیر اور خاص کر برطانیہ کے تقریباً تمام جزائر میں شائع ہوتے ہیں۔امجد مرزا اردو کے پختہ افسانہ نگاروں میں شمار ہوتے ہیں جو اپنے گردوپیش کے احوال ومسائل پر نہ صرف گہری نگاہ رکھتے ہیں بلکہ تاثرات وتجزیہ کو فنکارانہ چابکدستی اور ہنرمندی سے صفحہ قرطاس پر منتقل کرتے ہیں کہ قارئین واقعات کے مناظر میں خود کو شامل محسوس کرتے ہیں۔اس طرح وطن سے باہر آ کر آباد ہونے والے ایشیائی تارکین کے چھوٹے چھوٹے مگر اہم مسائل کو وہ اپنے قلم سے چھو کر افسانے کا لبادہ پہنانے کے باوجود ایک دیرپا حقیقت کا منصب عطا کرتے اور گہرے تفکر کو چھونے کے باوجود روزمرہ زندگی کی آسودہ ہر بحر کا جزو بنا کر خوش خرام رفتار اور سبک گفتار کے ساتھ قارئین کو ساتھ لے کر چلتے اور نقطہ عروج کی دہلیز تک لے جانے کا ڈھنگ جانتے ہیں۔مزید یہ کہ مقصود و حاصل تحریر کے چہرے سے نقاب کشائی پر پیدا ہونے والے سوالات اور فطری پیاس کی تسکین کے لئے مناسب ساز وسامان مہیا کرنے اور خوشگوار قرینے سے عہدہ برا ہونے کا سلیقہ بھی جانتے ہیں۔لگتا ہے انہوں نے نصابی علم سے کہیں زیادہ مشاہدہ اور تجزیہ کی اکتسابی تفہیم کو ذریعہ بنایا ہے' یہی وجہ ہے کہ تخلیق کو محض ذاتی احساسات وجذبات کے دائرہ کار سے نکال کر وسیع تر عصری آگاہی کا وسیلہ بنانے کی مسلسل کوشش ان کے ہاں نمایاں ہے' جو ان کی فنی استطاعت اور اثرپذیری کی حدود وقیود سے بے نیاز کر کے ہمہ گیر اور دیرپا آثار کا پیش کار ظاہر کرتی ہے۔برطانیہ کے ادبی حلقے اور اردو کے ہر قاری اور قاریہ نے ان کے افسانے بے حد پسند کئے اور مختلف جرائد میں ہمیشہ ان کی تحریر کے متعلق خطوط شائع ہوتے رہے۔مجھے دلی خوشی ہے کہ اب ان کی مطبوعہ اور غیر مطبوعہ تخلیقات کا مجموعہ شائع ہو رہا ہے جو انشاءاللہ ادب میں ایک نمایاں مقام پیدا کرے گا اور اہمیت کا حامل ہوگا اور ایک سنگ میل ثابت ہوگا۔میری دلی دعائیں اور نیک خواہشات ان کے ساتھ ہیں۔

دعا گو۔اختر ضیائی چیئرمین ''ایشین لٹریری سرکل'' لندن' اکتوبر 2000ء

اُوچ شریف

ابنِ خوشاب

اُوچ شریف کا تاریخی شہر ملتان سے جنوباً ۴۰ کلومیٹر کے فاصلے پر مشرق میں بہاولپور ضلع میں واقع ہے۔ یہ شہر تہذیبی، ثقافتی اور جغرافیائی اعتبار سے سرزمین سندھ سے وابستہ ہے اور پنجاب کے دریاؤں کے سنگم پر واقع ہے۔ اُوچ ایک انتہائی قدیم مذہبی اور روحانی مسکن کو قبل از مسیح میں بھی موجود تھا کہا جاتا ہے یہ سن 500 قبل مسیح بھی موجود تھا۔ سکندر اعظم کے حملے کے وقت اُوچ پر ہندوؤں کی حکومت تھی۔ بعض مؤرخین کا خیال ہے کہ سکندر اعظم شمالی ہند کے بعض حصوں کو فتح کرتا ہوا اوچ بھی آیا تھا اور اس نے یہاں چند ہفتے قیام بھی کیا تھا اُوچ کو ہے اسکندرہ بعض مؤرخین نے سکندرہ کا نام بھی دیا چناب کے سنگم پر ایک پلیٹو پر واقع دریائے راوی اور یہ شہر قدیم زمانے میں ایک نہایت خوبصورت اور خوشحال شہر تھا۔ محمود غزنوی کے حملے کے بعد اُوچ پر مسلمانوں کی حکومت قائم ہوئی جس کے بعد یہ اسلامی تعلیمات اور ثقافت کا اہم مرکز بن گیا۔ کہا جاتا ہے کہ یہاں ایک اسلامی یونیورسٹی بھی تھی جو اس علاقے میں اپنی طرز کا واحد ادارہ تھا جس میں بیک وقت اڑھائی ہزار طلبہ تعلیم حاصل کرتے تھے جو پورے عالم اسلام سے یہاں اسلامی تعلیم کے لئے آیا کرتے تھے۔ سلطان شہاب الدین غوری پہلا مسلمان حکمران تھا جس نے اس ادارے کی سرپرستی کی اس کے بعد غوری خاندان کے تمام حکمرانوں نے اُوچ ہی کو اپنا دارالحکومت بنایا۔ تاریخی اہمیت کے حامل اس منفرد شہر نے نہ صرف بہت سے لوگوں کی شان وشوکت دیکھی بلکہ زوال بھی دیکھا۔ سکندر اعظم اور محمد بن قاسم بھی ان میں شامل تھے۔ بھٹیوں اور غزنویوں کے ہاتھ سے ہوتا ہوا یہ علاقہ 1175ء میں سلطان شہاب الدین غوری تک آ پہنچا آہستہ آہستہ علاقے کے ایک گورنر ناصیر الدین قباچہ نے بہت طاقت حاصل کر لی اور ملتان اور اُوچ پر حکومت کرنے لگا۔ دہلی کے سلطان التمش نے 1228ء میں یہ علاقے فتح کر لئے یوں اس جگہ کی سیاسی اہمیت سالہ دور تقریباً ختم ہو کر رہی گئی۔ قباچہ کے 22 سالہ حکومت میں اُوچ ملتان کے سیاست، ثقافت اور علم کا مرکز بن چکا تھا۔ قباچہ خود مذہبی علماء فقراء، بزرگوں اور عالموں کی حوصلہ افزائی کرتا تھا۔ فارس اور افغانستان تک سے لوگ اس کے پاس آتے تھے۔ بہت سی خانقاہیں، مدرسے، سرائیں اور بزرگان دین کے مزارات اس دور میں بنائے گئے۔ بہاء الحلیم، موسیٰ پاک شہید، بی بی جیوندی، جہانیاں جہاں گشت راجن قتال اور ابوحنیفہ جیسے بزرگوں نے اس قصبے کو اپنے وجود سے سرفراز کیا۔ اُوچ کے عروج کے زمانے میں یہاں کی آبادی تین مختلف حصوں میں منقسم تھی۔ آج کا اُوچ ایک چھوٹا سا شہر ہے اُوچ شریف میں بیشمار بزرگان دین کے مزارات اور درگاہیں اور بیش قیمت تاریخی اہمیت کی عمارتیں قابل ذکر ہیں۔

(روزنامہ دنیا 20 اگست 2015ء)

ایک خطبہ جمعہ

نذیر ناجی

خطبہ جمعہ کا سرکاری مسودہ پڑھنا ہی مناسب سمجھتے ہیں۔ بیشتر علما کی رائے ہے کہ بعض خطیب' جمعے کے دن فرقہ وارانہ مسائل اٹھا کر فرقہ واریت کو ہوا دیتے ہیں۔ مختلف فرقوں کے عقائد پر تنقید کر کے باہمی نفرتوں کو اُبھارتے ہیں اور پھر گمراہ کن تصورات پیش کر کے' نہ صرف ان کے عقائد پر تنقید کرتے ہیں' بلکہ بعض تو اتنے جوش میں آ جاتے ہیں کہ عقائد کا حوالہ دے کر ان پر کفر کا الزام لگاتے ہیں۔ اسی پر بس نہیں کرتے بلکہ اپنے سامعین کو اُکساتے ہیں کہ ان کے ساتھ میل جول اور تبادلہ خیال ترک کر دیں۔ یہ فرقہ وارانہ منافرت بڑے فسادات پیدا کرتی ہے۔ اسی خرابی سے بچنے کے لئے متعدد ممالک نے' خطبہ جمعہ کا ایک ہی مسودہ تیار کر رکھا ہے' جسے پڑھنا ہر مسجد کے امام پر لازم کیا گیا ہے۔ کچھ لوگوں نے خصوصاً ٹی وی پر بولنے والے اینکرز اور نصف اینکرز نے اعتراضات اُٹھائے ہیں کہ یہ تو آزادی اظہار پر پابندی ہے جبکہ اسی آزادی اظہار کے نام پر' گمراہ کن تصورات پھیلائے جاتے ہیں۔ یہ اسی نام نہاد آزادی اظہار کا نتیجہ ہے کہ ایک ہی دین کے ماننے والے' اکٹھے نماز ادا نہیں کر سکتے۔

فرقہ وارانہ بنیادوں پر مسجدیں تعمیر کی جاتی ہیں۔ صرف اسی فرقے سے تعلق رکھنے والے لوگ' ان مساجد میں نماز کے لئے جا سکتے ہیں جبکہ دوسرے فرقے کے لوگوں کو وہاں داخلے کی اجازت نہیں دی جاتی۔ مختلف فرقوں نے اپنے اپنے عقائد کے نام پر' ایسے گمراہ کن تصورات پھیلا رکھے ہیں کہ کوئی بھی صاحب ایمان' اُنہیں سننا بھی برداشت نہیں کرتا۔ دنیا بھر کے مسلمان' دو مقدس مقامات پر اکٹھے ہوتے ہیں۔ وہاں وہ اپنے فرقے اور عقیدے کی پابندی نہیں کرتے۔ وہی خطبہ سنتے ہیں' جو امام کعبہ یا مسجد نبوی ﷺ کا امام دے۔ اس کے برعکس ان دو مقدس مقامات سے باہر نکلنے کے بعد' ایک ساتھ نماز نہیں پڑھ سکتے۔ وہاں وہ اپنے اپنے فرقے کی مسجد ڈھونڈتے ہیں' حالانکہ دین میں ایسی کوئی پابندی نہیں۔ سوال یہ ہے کہ جب ہر فرقے سے تعلق رکھنے والے مسلمان' خانہ کعبہ اور مسجد نبوی ﷺ میں اکٹھے نماز پڑھتے ہیں' تو باقی مقامات پر ان کی مساجد کیوں الگ الگ ہیں؟ اسی طرح مسجد نبوی ﷺ اور خانہ کعبہ میں نمازیں ادا کرنے کے لئے مرد و زن کی کوئی تقسیم نہیں۔ سب ایک ساتھ طواف کرتے ہیں۔ ایک ساتھ سعی کرتے ہیں۔ ایک ساتھ نمازیں پڑھتے ہیں۔ لیکن جیسے ہی ان دو مقدس مقامات سے باہر نکلتے ہیں تو اپنے اپنے راستے' الگ الگ چنتے ہیں۔ کئی فرقے ہیں' جو اپنی مساجد میں صرف مردوں کو نماز پڑھنے کی اجازت دیتے ہیں۔ کچھ ایسے ہیں' جہاں مسجد میں خواتین کے لئے علیحدہ جگہ بنائی جاتی ہے اور مردوں کے لئے علیحدہ۔ میں صرف پاکستان کی بات کر رہا ہوں۔ یہاں شاذ و نادر ہی مساجد میں خواتین کو نمازیں پڑھنے کی اجازت دی جاتی ہے۔ البتہ اہل تشیع کے ہاں' اس سلسلے میں زیادہ سختی سے کام نہیں لیا جاتا۔ میں آپ کو ایک

واقعہ سناتا ہوں۔ بہت سے موقعے ایسے آئے جب تمام سیاسی جماعتوں نے متحدہ محاذ بنائے۔کئی اسلام کے نام پر بنائے گئے۔کئی قوم پرستی کے نام پر اور کئی فرقوں کے نام پر۔ بظاہر ان سب کا نعرہ' یکجہتی اور اتحاد ہوتا ہے لیکن نمازیں سب اکٹھے نہیں پڑھتے۔میرا مشاہدہ ہے کہ ایک اسلامی اتحاد میں اہل حدیث کی ایک تنظیم شامل ہوتی تھی اور اہل تشیع کی دوسری۔سنی اپنی جماعت آپ کھڑی کرتے تھے اور دوسرے اپنے فرقے والوں کے ساتھ نماز ادا کرتے۔جن سیاسی کارکنوں نے ایسے اجتماعات میں حصہ لیا ہے' انہیں یقیناً ایسے مناظر یاد ہوں گے کہ ایک ہی اتحاد میں شامل ایک فرقے کے لوگ اپنی نماز علیحدہ پڑھتے ہیں اور دوسرے فرقے سے تعلق رکھنے والے علیحدہ۔اسلام ایک مکمل ضابطہ حیات ہے۔سب کا ایک خدا ہے۔سب ایک ہی رسول اکرم ﷺ پر ایمان رکھتے ہیں۔سب ایک ہی نماز پڑھتے ہیں۔بعض نے تو نماز میں بھی اپنے اپنے اضافے کر رکھے ہیں۔اگر دین کو دیکھا جائے تو اس میں نمازوں کے لئے علیحدہ علیحدہ جماعتیں کھڑی کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ہر فرقے کے لوگ ایک ہی میدان یا مسجد میں کھڑے ہو کر' ایک ساتھ نماز ادا کر سکتے ہیں۔مگر عملاً ہم ایسا نہیں کرتے۔اتحاد ضرور بنائیں گے۔نعرے بھی ایک جیسے لگائیں گے۔کلمہ بھی ایک پڑھیں گے لیکن نماز پڑھنے کے لئے' الگ الگ صفیں بنا کر' علیحدہ اماموں کے پیچھے نمازیں پڑھیں گے۔یہی کافی نہیں بلکہ مختلف فرقوں کے لوگ سات محلے چھوڑ کر' اپنے فرقے کی مسجد میں نماز پڑھنے جاتے ہیں۔یہ تقسیم دین میں موجود نہیں۔ ہر مسلمان کا خدا ایک ہے۔ اللہ کا رسول ﷺ ایک ہے۔قرآن ایک ہے۔نمازیں ایک برابر ہیں۔پھر یہ جمع کیوں نہیں ہوتے؟ اکٹھے نمازیں کیوں نہیں پڑھتے؟ اکٹھے دعائیں کیوں نہیں مانگتے؟ ہر ملک کی سیاست اور معاشرت الگ الگ ہوتی ہے۔اگر ملک میں مسلمانوں کی اکثریت ہے تو یقینی طور پر' مملکت کا سربراہ بھی مسلمان ہی ہوگا' جیسا کہ بیشتر ملکوں میں ہے۔ان کے مسائل بھی ایک جیسے ہوں گے۔دعائیں بھی ایک جیسی ہونی چاہئیں۔خطبے کے ساتھ' ہر امام کو اپنی قوم اور ملک کی سلامتی اور بہتری کے لئے دعائیں مانگنا چاہئیں۔یہ دعائیں اجتماعی کیوں نہ ہوں؟ سب کا خطبہ ایک جیسا کیوں نہ ہو؟ پورے ملک میں یکساں خطبے کا مطلب' سب کے لئے خیر' نیکی اور ملک وقوم کی فلاح ہونا چاہئے۔ایک خطبے پر اتفاق' نماز جمعہ کی رُوح کے عین مطابق ہے کیونکہ ہم ہر مسجد کو جامع مسجد نہیں کہتے۔گویا کئی مساجد میں جمعے کی نماز نہیں پڑھائی جاتی بلکہ ایسی مسجد کا انتخاب کیا جاتا ہے' جہاں زیادہ لوگ ایک ساتھ نماز پڑھ سکیں۔ہفتے بھر میں صرف یہی ایک نماز ہے' جس میں خطبہ پڑھا جاتا ہے اور اسے زیادہ لوگ' سننے آتے ہیں۔اگر علما کرام کا مرتب کیا ہوا ایک ہی خطبہ' پورے ملک میں پڑھا جائے تو اس میں مضائقہ کیا ہے؟ بعض خبروں میں تاثر دیا گیا ہے' جیسے یہ تجویز صرف سندھ کے لئے ہے۔میرا یہ خیال نہیں' کیونکہ صوبائی مشیر مذہبی اُمور کے بیان میں یہ بات موجود ہے کہ سندھ میں اتفاق رائے کے بعد' وہاں کی صوبائی حکومت یہ تجویز لے کر' وفاق میں بھی جائے گی اور کوشش کرے گی کہ سارے صوبوں اور وفاقی دارالحکومت میں بھی' جمعۃ المبارک کا ایک ہی خطبہ پڑھا جائے۔جب 95 فیصد آبادی مسلمانوں کی ہے تو سب کے سب جمعے کے روز ایک ہی خطبہ کیوں نہ سنیں؟ پورے ملک کے لئے علما کرام کا تیار کردہ خطبہ دینی' علمی اور قومی اعتبار سے زیادہ وقیع اور اعلیٰ ہوگا۔جمعے کی نماز پڑھانے والے ہر امام کی علمی سطح ایک جیسی نہیں ہوتی۔کچھ زیادہ پڑھے لکھے ہوتے ہیں' تو کچھ کم۔جو خطیب دوسروں کے مقابلے میں دین کا علم زیادہ رکھتے ہوں' ان کا مرتب کیا ہوا خطبہ' انفرادی خطبے سے بہتر ہو گا۔زیادہ سے زیادہ لوگوں کا ایک جگہ جمع ہو کر جمعۃ المبارک کی نماز پڑھنا' زیادہ مبارک اور یکجہتی کا ثبوت ہوگا۔اگر ملک میں مسلمانوں کی اکثریت ہے تو یقینی طور پر' مملکت کا سربراہ بھی مسلمان ہی ہوگا' جیسا کہ بیشتر ملکوں میں ہے۔ان کے مسائل بھی ایک جیسے ہوں گے۔دعائیں بھی ایک جیسی ہونی چاہئیں۔(یو کے ٹائمز لندن ۲۰ جنوری ۲۰۱۶)

مسلمان ہند اور مولوی

(رانا محمد حسن)

فسادات پنجاب تحقیقات عدالت نے جب مولانا عبدالحسنات سید محمد احمد قادری صدر جمعیت العلمائے پاکستان سے ایک سوال یہ بھی کیا کہ ''اگر ہندو اپنے حکومت میں منوشاستر کے تحت مسلمانوں سے ملیچھوں یا شودروں کا سا سلوک کرے تو کیا آپ کو کوئی اعتراض ہوگا؟ تو اُن کا جواب تھا ''جی نہیں'' اور یہی سوال مودودی سے کیا گیا تو آپ نے فرمایا۔ یقینا مجھے اس پر کوئی اعتراض نہ ہوگا حکومت کے اس نظام میں مسلمانوں سے ملیچھوں یا شودروں کا سا سلوک کیا جائے ان پر منو کے قوانین کا اطلاق کیا جائے اور انہیں حکومت میں حصہ اور شہریت کے حقوق قطعا نہ دئے جائیں اور حقیقت یہی ہے کہ اس وقت بھی ہندستان میں صورت حال یہی ہے'' اور یہ میاں طفیل صاحب کالعدم جماعت اسلامی کے امیر تھے۔(رپورٹ تحقیقاتی عدالت 1953ء)

قارئین ایسے خیالات کے نام نہاد مولوی نہ جانے کس اسلام کی بات کرتے ہین۔کیا انہیں معلوم نہیں کہ رسول کریم ﷺ نے مدینہ کے غیر مسلم شہریوں کو کیا حقوق دئے تھے؟ کیا ان کے ساتھ مذہب کی وجہ سے امتیاز برتا گیا تھا؟ کی ان کی عبادت گاہوں کو مسمار کرنے کا حکم دیا گیا تھا؟ کیا ریاست کے شہری ہونے کے ناطے ان کے حقوق مسلمانوں کے حقوق کے برابر نہیں تھے۔؟ کیا اُن کے مقدمات کا فیصلہ ان کی مذہبی کتاب کے مطابق نہیں کیا جاتا تھا؟ حقیقت اسلامی ریاست میں جس کے سربراہ ہمارے حبیب آقا حضرت محمد ﷺ تھے تمام مذاہب کے لوگ آرام و راحت سے تھے۔تصور تو کیجئے جس حکومت میں غیر مذاہب کے حقوق کا اس قدر خیال رکھا جاتا ہو اُس کے سربراہ کو دوسری غیر اسلامی ریاستوں میں بسنے والے مسلمانوں کی تکلیف تڑپاتی نہ ہوگی۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ غیر اسلامی حکومتیں جب اسلامی ریاست میں اپنے ہم مذہب لوگوں کو سکون وچین سے رہتے دیکھتیں تو وہ بھی مسلمانوں کے حقوق کا خیال رکھنے کی کوشش کرتیں اور غیر مسلم عوام بھی جب اپنے حکمرانوں کی

زیادتیاں دیکھتیں تو اسلام کی سنہری تعلیم سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکتی۔۔آخر ہوا بھی یہی دیکھتے سارا عرب اسلام کی پُرامن چھتری کے نیچے آ گیا۔۔مولوی کی منطق یہ ہے کہا ہمارے پاکستان میں ہمیں ہر قسم کے ظلم کرنے کی آزادی ہونی چاہیے اقلیتوں کے گرجا مندر گوردوارے جو پاکستان میں ہیں وہ ہمارے رحم و کرم پر ہیں چاہیں تو انہیں جلا دیں اور چاہیں تو ان میں عبادت کرنے والوں کو بھی جلا دیں۔اس ظلم کے نتیجہ میں ہندوستان یا عیسائی حکومتیں جس طرح کا حکم بھی اپنے مسلمان شہریوں پر روا رکھیں ہمیں کوئی سروکار نہیں۔ہم تو غیر مسلموں کا شودر اور ملیچھ ہی کہیں گے اور سمجھیں گے چاہے اس کے نتیجہ میں غیر مسلم حکومتیں اپنے مسلمان شہریوں کے ساتھ ملیچھوں اور شودروں سے بھی بدتر سلوک کریں۔گویا یہ مولوی نہ صرف غیر مسلموں کے دشمن ہیں بلکہ اپنے مسلمان بھائیوں کے خون کے پیاسے ہیں دراصل یہ مولوی قوم صرف اپنے پیٹ سے مخلص ہے اور صرف اس کی خدمت گزاری کے لئے اسلام کا نام استعمال کرتی ہے۔اسلام کی حقیقت سے یہ نام نہاد ملائیت بالکل بے خبر ہے۔مذہب اسلام تو جانوروں کے حقوق ادا کرنے کا حکم دیتا ہے۔مندرجہ بالا مولوی کی منطق ان کی علمیت کا گھڑا پھوڑنے کے لئے کافی ہے۔مولوی کی خودساختہ منطق کو قطعاً اسلامی نہیں کہا جا سکتا۔

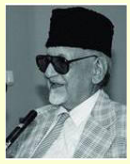

برگزیدہ شجر

(رانا عبدالرزاق خان لندن)

آؤ مضطرؔ کا ذکر خیر کریں۔۔۔مر کے بھی جو حیات ہے یارو

افسوس محترم چوہدری محمد علی مضطرؔ عارفی ہم میں نہیں رہے۔آپ ۱۱ دسمبر ۱۹۱۷ء کو فیروز پور انڈیا میں پیدا ہوئے اور ۱۴ اگست ۲۰۱۵ء کو ربوہ میں وفات پائی۔ ۱۹۴۴ء میں تعلیم الاسلام کالج قادیان سے وابستہ ہوئے۔وہ ایک پروفیسر کے علاوہ تاریخ تھے بلکہ مورّخ تھے۔وہ ایک ناصح تھے،وہ ایک شفیق باپ تھے،وہ ایک ماہرِ تعلیم،انگریزی دان،عظیم دانشور، قابل منتظم،دیدہ وَر،پروفیسر، لائق مشیر، دیانتدار ناظم،ایڈمنسٹریٹر، ذہین مصنف،ٹرانسلیٹر ، بلکہ ہمہ جہت انسان تھے۔وہ ایک نہایت عاجز انسان بھی تھے،بہت ہی خوبیوں کے مالک اور سلطانِ نصیر تھے۔فلسفہ،نفسیات اور انگریزی زبان و ادب کے ماہر پروفیسر تھے،تعلیم الاسلام کالج میں ہوسٹل،تیراکی،کشتی رانی،کوہ پیمائی، باسکٹ بال،یوٹی سی،آئی ٹی سی کے شعبہ جات کے انچارج بھی رہے۔آپ پاکستان قومی باسکٹ بال فیڈریشن کے سینئر وائس پریذیڈنٹ بھی رہے۔اسی طرح پنجاب یونیورسٹی کے سینٹ اکیڈمک کونسل اور بورڈ آف سٹڈیز (نفسیات) کے ممبر رہے۔خلافت کے عاشق،اطاعت کے دلدادہ،ہر کسی کو محبوب تھے۔اُن کی زندگی پر طائرانہ نظر کے لئے بھی ایک دیوان درکار ہے۔وہ حضرت مصلح موعودؓ کے مجاہد،حضرت مرزا ناصر احمد کے دستِ راست،ہمسفر و پرائیویٹ سیکٹری،خلافت رابعہ و خامسہ کا معاون اور سلطان نصیر بلکہ ایک مثالی احمدی کارکن تھے۔خلافت کا ذکر آتے ہی اُس بزرگ کے ہونٹ تھرتھرانے لگتے تھے۔اُس کے جسم میں محبت اور اطاعت سے ایک کپکپی طاری ہو جاتی تھی۔تعلیم الاسلام کالج کی دیکھ بھال میں،ہوسٹل کی ذمہ داریوں کو اس طرح نبھایا کہ آج بھی ہزاروں طلباء اُن کا ذکر بے حد تعظیم سے کرتے ہیں۔تعلیم الاسلام کالج کی شہرت اور اسکی قدآوری میں چوہدری محمد علی کی مساعی کو ہم کبھی بھی بھول نہیں سکتے۔وہ بانی رُکن تھے وہ ایک شفیق باپ کی طرح پڑھاتے بھی تھے اور جوانوں کا کردار بھی تعمیر کرتے تھے جس طرح باپ اپنے بیٹے کا خیال رکھتا ہے۔باسکٹ بال میں صحت مند، قدآور بچوں کو منتخب کرنا،اُن کو کھیل کی ترغیب دینا،اُن جوانوں کو ڈسپلن سکھانا،جماعتی اخلاق کا درس دینا اُن کی زندگی تھی،یہ سب کچھ انہوں نے خلافت کے عشق میں کیا۔سب کو زندگی بھر دعا دی،سب ہی کو دوست،بھائی اور بیٹے جان کر نصائح کیں۔سب کے دُکھ کو اپنے دُکھ جان کر سینے سے لگایا،اور زندگی بھر خلافت کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنایا،حضرت خلیفۃ المسیح الثالث کے ساتھ ۱۹۶۷ میں بیرون ممالک کے سفر پر بھی جانے کا شرف حاصل ہوا،شاعری میں بھی خلافت کا ذکر بار بار ملتا ہے۔آپ کی رمزیہ شاعری آج کے دور میں منفرد مقام رکھتی ہے۔جو کہ خلافت کے اردگرد گھومتی ہے اسے جاننے اور سمجھنے کے لئے ایک عقل و خرد سے بھرپور دماغ چاہیئے۔آپکی شاعری میں ندرت،رفعت،تخیل،سادگی،اور گداز پایا جاتا ہے،نیز فلسفہ،نفسیاتی ترفع اور جذباتی تنوع کی آئینہ دار ہے۔ہر شعر میں اطاعت،محبت،عشق و پیار سے سرشار ایک غلام کا عکس دکھائی دیتا ہے،اُن کے عشق میں بلالی شان اور اویسی کردار کی جھلک ہے۔ایسا عشق جو کردار میں بھی تھا اور عمل میں بھی تھا،کوئی کام یا فرض جب بھی اُن کے ذمہ لگایا گیا،اُس مردِ فقیر نے بدرجہ اَتم اُسے مکمل شوق سے سرانجام دیا،تراجم میں تو اس مطبع نے اپنی خداداد ذہانت کو بروئے کار لا کر آنے والے پیشروؤں کے لئے ایک مثال قائم کر دی۔اے میرے دوستو! مضطر کو پڑھو تا کہ ہمیں زندگی گزارنے کا سلیقہ آئے۔خلافت کے دیوانے کے کردار کی ضو سے حصہ لینے کی سعی کرو،جو ۸۰ سال تک اس اطاعت کے سمندر میں غوطہ زن ہو کر بیش قیمت موتیوں کی تلاش میں کامیاب رہا،جو مولوی محمد علی سے بھی بہتر اطاعت کا حق ادا کرتے ہوئے اس دنیا سے کامیاب مراجعت کر گیا۔جسے خلفائے وقت نے بھی کمال محبت سے نوازا،اور اس دنیا کے عظیم خاکساروں نے بھی اسے خراج تحسین پیش کیا۔اُس مردِ قلندر کی کس کس بات کا ذکر کروں،اُس کی محبتوں کا ذکر کروں تو اُس کی جدائی پا کر کلیجہ منہ کو آتا ہے،اُس کی نصائح پر جب غور کرتا ہوں تو اُس کی دھیمی دھیمی گفتگو سے خلفاء کے خطبات کی جھلک نظر آتی ہے،آپ خلافت کے سچے مطیع و فرمانبردار اور نظام جماعت کے ساتھ اخلاص و وفا کا تعلق رکھنے والے تھے،قابلِ فخر مقام ہونے کے باوجود عُجب و خود پسندی نام کو نہ تھی،ریاکاری سے پاک،نرم خو،نرم زبان،انسانیت کے ہمدرد اور نیک انسان تھے۔اُن کے کردار پر جب نظر دوڑاتا ہوں تو خود کو ایک حقیر کیڑا پاتا ہوں۔جب اُس کے کام اور اس کی کاوشوں کی وُسعت پر نظر کرتا ہوں تو حیران و ششدر رہ جاتا ہوں۔یقیناً اُس مردِ نفیس کو محمد ﷺ کی دعا اور علیؓ کی طاقت حاصل تھی جسے خلافت احمدیہ کی برکات نے پالش کر دیا تھا،جو آج ہمیں ایک نگینہ کی مانند نظر آتا ہے۔کاش ہم سب مضطرؔ عارفی جیسے خوبصورت نگینے بن جائیں۔اور خلافت کی خوشبو کو اکنافِ عالم میں بکھیر دیں تا کہ ہمارا خدا ہم سے راضی ہو جائے۔آمین۔

چپکے سے چلا گیا ہے بچھڑ کر　　مضطرؔ نے کمال کر دیا

مشاعرہ: جامعہ کراچی فارغ التحصیل المنائی فورم کینیڈا

از۔ تسلیم الٰہی زلفی

President
Urdu TV Canada
24 Hrs. Urdu Channel ROGERS 851
Since January 2000 in Toronto
URDU TV CANADA
Tasleem Elahi Zulfi
Newscaster & Show Host
تسلیم الٰہی زلفی
142 Oxford Street
Richmond Hill, Ontario
L4C 4L7
Canada
Mobile: 416 737 3458
Res/Fax: 905 780 1916
E-mail: zulfi@rogers.com
Website: www.zulfi.ca

Tasleem Elahi Zulfi
Executive Director
University of Karachi
Graduates Forum Canada
جامعہ کراچی
فارغ التحصیل المنائی فورم کینیڈا
uok-graduates-forum-canada@rogers.com 416 737 3458

انجمن اُردو کینیڈا
Urdu Society of Canada (Since 1972)
سرپرست: فیض احمد فیض (مرحوم) بانی: حفظ الکبیر قریشی (مرحوم)
ایگزیکیٹو ڈائریکٹر: تسلیم الٰہی زلفی ۔ ٹورونٹو
urdu-society-ofcanada@rogers.com 416 737 3458

Radio Pakistan Karachi
BAZM E TALABA FORUM
Canada, USA & UK
ریڈیو پاکستان کراچی
بزم طلباء فورم
کینیڈا، امریکا اور برطانیہ
سرپرست: یاور مہدی
چیف آرگنائزر: تسلیم الٰہی زلفی
416 737 3458
radio.pakistan.btf@gmail.com

مشاعرہ قندیل شعروسخن لندن

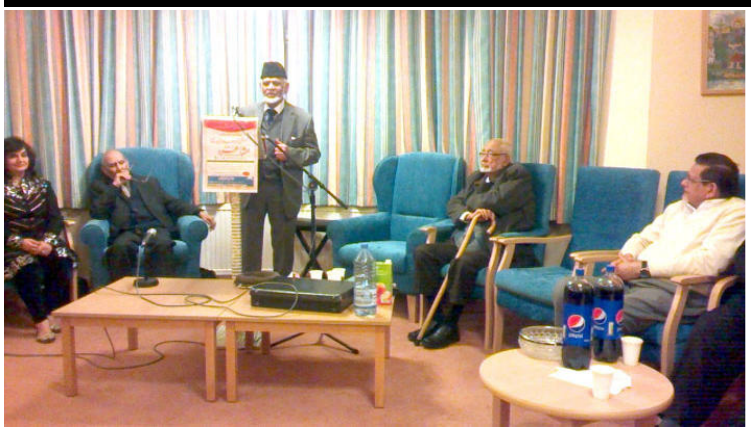

(پیشکش: عاصی صحرائی)

بزم قندیل شعروسخن برطانیہ کے بانی رانا عبدالرزاق خان ہیں۔ جو اسے آٹھ سال سے چلا رہے ہیں۔ اور اب تک بیسیوں کامیاب مشاعرے کروا چکے ہیں۔ یہ مشاعرہ بھی ان ہی کی ایک کاوش ہے۔ مورخہ ۲۸ دسمبر ۲۰۱۵ء کو کوئین الزبیتھ بلڈنگ کے ہال میں مشاعرہ تھا۔ سب لوگ بروقت پہنچے مگر سوہن راہی اور نیلم جوگن صاحب آدھ گھنٹہ دیر سے تشریف لائے۔ بہر ہال مشاعرے کی کاروائی شروع ہوئی۔ آدم چغتائی کو صدر مجلس کی کرسی پیش کی گئی۔ نیلم جوگن کو مہمان خصوصی کی کرسی پیش کی گئی۔ تلاوت فرخ صاحب نے کی اور نعتیہ کلام آصف چغتائی نے پڑھا۔ آج سوہن راہی کی کتاب ''کنگن تیرے بولوں کے'' کی رُونمائی ہے۔ نظامت جناب رانا عبدالرزاق خان مشہور کالم نگار مدیر گوشہ ادب یو کے ٹائمز و مدیر قندیل ادب انٹرنیشنل کے حصے میں آئی۔ ہال سامعین سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ آڈیو وڈیو کا انتظام حسب سابق جناب فضل عمر ڈوگر اور عامر امیر کر رہے تھے۔ کتاب کی رُونمائی کی کاروائی شروع ہوئی۔ پہلے تو رانا عبدالرزاق خان نے اس کتاب کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ جو کہ مفصل اور دلکش تھا۔ سوہن راہی صاحب کی یہ چودھویں کتاب ہے۔ وہ ساٹھ سال سے ادب کی خدمت کر رہے ہیں۔ جو کہ ہم سب کے لئے ایک مثال ہیں۔ اس کے بعد سوہن راہی صاحب نے اس کتاب کے سب مراحل کے متعلق کہانی سنائی۔ جو کہ کافی محظوظ کن تھی۔ ان کے بعد آدم چغتائی صاحب نے ''کنگن تیرے بولوں کے'' پر اپنا بلیغ تبصرہ کیا، اور سوہن راہی کی مسلسل نصف صدی کی ادب کی خدمات کو سراہا۔ اس کے بعد مشاعرے کا آغاز ہوا۔ پہلے حسب روایت پہلے نظم مشاعرہ نے اپنا کلام سنایا۔ باقی شعراء کے نام جنہوں نے اس مشاعرے میں حصہ لیا وہ یہ ہیں۔ رمضان شائق، عبدالقدیر کوکب، منظور احمد ریحان، طارق مجید، عاصی صحرائی، عبدالمجید ظفر، مرغوب صدیقی، ریاست رضوی، ثروت اقبال، عتیب جاذل، عامر امیر، ساجد محمود رانا، نیلم جوگن سوہن راہی، آدم چغتائی، مبارک صدیقی۔ بعد میں ایک حمدیہ نظم خالد چغتائی نے بھی سنائی۔ آج ہمارے نوجوان شعراء عتیب جاذل، ساجد محمود رانا، عامر امیر نے اپنا چنیدہ کلام سنایا اور سامعین نے کھلے دن سے داد سے نوازا۔ یہ سماں بہت ہی دل کش تھا، اور سبھی شاملین خوش اور فرحاں تھے۔ ہر طرف سے واہ، واہ کے ڈونگرے برسائے جا رہے تھے۔

آخر پر جرمنی سے تشریف لائے ہوئے صحافی جناب عرفان دہلوی نے اپنے تاثرات کا اظہار کیا، اس کے بعد جناب محترم بشیر احمد رفیق سابق امام مسجد فضل لندن نے کارکنوں کی کاوشوں کو سراہا۔ اور ایسے ادبی پروگرام منعقد کرنے کی حوصلہ افزائی کی۔ محترم بشیر احمد رفیق سابق امام مسجد فضل لندن نے آخر پر دعا کرائی اور پھر ڈنر پیش کیا گیا۔ سامعین کی تعداد پچاس تھی۔ یہ ایک یادگار شام تھی۔ اور اس سال کو بخوشی الوداع کرتے ہوئے ہم سب دعا کے ساتھ ایک دوسرے سے پھر اکٹھے ہونے کے لئے جدا ہوئے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اُردو ادب کی ترقی کے لئے یونہی توفیق دیتا رہے۔ آمین۔